

ختم المرسلین، رحمۃ للعالمین، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ پر

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی کی جملہ کتب

سیرت النبی ﷺ سیریز

کے عنوان سے تین ضخیم جلدوں میں

سیرت النبی ﷺ اور ہماری زندگی  
(رسول اکرم ﷺ اور ہم)

سیرت النبی ﷺ اور فلسفہ انقلاب  
(منہج انقلاب نبوی ﷺ)

خطبات سیرت النبی ﷺ  
(سیرت خیر الانام علیہ السلام)

❁ صفحات: 1100 ❁ معیاری کاغذ ❁ عمدہ طباعت ❁ دیدہ زیب ٹائٹل ❁ مضبوط جلد

ماہ ربیع الاول میں مکمل سیٹ

2500 روپے کے بجائے صرف 1200 روپے

فری ہوم ڈیلیوری  
کے ساتھ

مکتبہ خدام القرآن

36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور: فون: 3-(042)35869501

وائس ایپ نمبر: 0301-111-5348 maktaba@tanzeem.org

ربیع الثانی 1446ھ  
اکتوبر 2024ء



ماہنامہ  
میتاق

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمد

فتنہ قادیانیت: زوال کا آغاز

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

وَأَذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (المائدة: ٤)  
ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے فرما کر لیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

## مشمولات

- 5 \_\_\_\_\_ عرضِ احوال ✨  
سب ہوش کے ناخن لیں  
خورشید انجم
- 9 \_\_\_\_\_ بیان القرآن ✨  
التَّيْنِ + العَلَقِ + القَدْرِ  
ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- 23 \_\_\_\_\_ تذکرہ و تبصرہ ✨  
فتنہ قادیانیت: زوال کا آغاز  
ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- 37 \_\_\_\_\_ حسن معاشرت ✨  
☆ تربیت اولاد: باپ کا کردار  
راحیل گوہر صدیقی
- 47 \_\_\_\_\_ انوارِ ہدایت ✨  
☆ گھر: ہماری دعوت کا اولین میدان  
شعبہ تعلیم و تربیت
- 53 \_\_\_\_\_ تذکیر و موعظت ✨  
انفاق فی سبیل اللہ  
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ
- 59 \_\_\_\_\_ ظروف و احوال ✨  
چند مہلک منکرات  
حافظ محمد اسد
- 65 \_\_\_\_\_ خطوط و نکات ✨  
مسئلہ فلسطین: ایک طائرانہ نظر  
ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
- 74 \_\_\_\_\_ دعوتِ فکر ✨  
ایک تصحیح - ایک وضاحت  
ادارہ
- 77 \_\_\_\_\_ دعوتِ فکر ✨  
کیا ابتدائی دور کا انسان جنگلی تھا؟  
رضی الدین سید



# میثاق

ماہنامہ

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مجلس ادارت:

ایوب بیگ مرزا خورشید انجم

ادارسی معاون:

حافظ محمد زاہد محمد خلیق

جلد : 73

شمارہ : 10

ربیع الثانی 1446ھ

اکتوبر 2024ء

فی شمارہ : 50 روپے

سالانہ زریع تعاون : 500 روپے

مدیر  
حافظ عاکف سعید

نائب مدیر  
حافظ خالد محمود حضر

## مکتبہ خدام القرآن لاہور



مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 3-35869501

ای میل: 0301-1115348@maktaba@tanzeem.org

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: ”دارالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375 (042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## سب ہوش کے ناخن لیں!

پاکستان تحریک انصاف کے بانی رہنما اکبر ایس بابر نے اپنے بیان میں انکشاف کیا ہے کہ ایک بین الاقوامی ایجنڈے کے تحت ایسی تمام سیاسی اور بظاہر قوم پرست قوتوں کو اکٹھا کیا جا رہا ہے جو پاکستان کی سالمیت اور قومی سلامتی کے اداروں کو کسی نہ کسی بہانے چیلنج کر رہی ہیں۔ کچھ مغربی ممالک کے سفارت کار اس سلسلے میں پوری طرح متحرک ہیں اور نجی محفلوں میں خیبر پختونخوا اور بلوچستان سے تعلق رکھنے والے تمام سیاست دانوں کو ایسی قوتوں کا ساتھ دینے کی ترغیب دے رہے ہیں جن کا مقصد ایک مشترکہ پلیٹ فارم تشکیل دے کر پاکستان کے وفاق کے خلاف شیخ مجیب الرحمن کے چھ نکات کی طرز پر مطالبات کرنا ہے۔ اکتوبر کے مہینے میں اس سلسلے میں اہم پیش رفت متوقع ہے۔ اکبر ایس بابر نے جس صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے اب وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے اور ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی ہے اور ہر قلب حساس مضطرب ہے کہ انجام گلستان کیا ہوگا، دستور بہاراں کیا ہوگا! یہ سب ہماری اپنی ناپلی اور کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ اغیار اور اعداء ایسی صورت حال کی تاک میں ہوتے ہیں بالکل اس کہاوٹ کی مانند کہ جب تند و گرم ہو تو اڑوس پڑوس کے لوگ روٹیاں پکانے آجاتے ہیں۔ چنانچہ کچھ عرصے سے وطن عزیز کے مختلف حصوں میں جو حالات اور واقعات رونما ہو رہے ہیں اس نے ہر حساس شخص کی تشویش میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس وقت ہر پاکستانی مسلمان خواہ امیر ہو یا غریب پڑھا لکھا ہو یا آن پڑھ بڑا ہو یا چھوٹا، ملک و ملت کے بارے میں شدید اندیشہ محسوس کر رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں صوبائیت اور لسانیت کا بیج تو اسی وقت ہی بودیا گیا تھا جب ہمارا عزیز ملک معرض وجود میں آیا تھا۔ ابتدا ہی سے لسانی بنیادوں پر بنگالی عوام کی ناراضگی مول لے لی گئی۔ انہوں نے ۱۹۵۶ء کے آئین میں جو پہلے ہی دیگر کئی وجوہات کی بنا پر التوا دتا خیر کا شکار تھا، اردو زبان کو قومی زبان تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ بعد میں ان کے مطالبہ کو تسلیم

کرتے ہوئے اردو کے ساتھ بنگالی کو بھی قومی زبان کا درجہ دے دیا گیا تھا، لیکن آپس میں اختلافات کی خلیج بڑھتی ہی چلی گئی اور بالآخر پاکستان دو لخت ہو گیا۔ پاکستان کو یوں دو ٹکڑے ہوتے دیکھ کر بھی ہمارے سیاست دانوں اور مقتدر حلقوں نے سبق نہ سیکھا اور ملک کے دوسرے صوبوں میں بھی وقتاً فوقتاً صوبائیت اور لسانیت کو ہوا دی جاتی رہی۔ کبھی سندھ و دیش کے نعرے لگے تو کبھی عظیم تر بلوچستان کا واویلا مچایا گیا، کبھی پختونستان کا راگ الاپا گیا اور کبھی مہاجر قوم کے نام پر انتشار پھیلا یا گیا۔ صوبائیت پرستی نے ملک کو بہت نقصان پہنچایا، جس سے اغیار نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ بھارت نے علیحدگی پسندوں کو ہر طرح کا تعاون فراہم کیا اور انہیں مالی فوائد کا لالچ دے کر پاکستان کے خلاف اکسایا۔ امریکہ اور بھارت نے پاکستان کو توڑنے کی بھرپور کوششیں کی جو آج تک جاری ہیں۔ ”را“ کے جتنے بھی جاسوس پکڑے گئے، وہ در دراز اور سہولیات سے محروم علاقوں میں تخریب کاری میں ملوث پائے گئے، جس کا اعتراف انہوں نے خود کیا۔ کھوشن یاد یو اور اس کا نیٹ ورک اس کی تازہ ترین مثال ہے۔

ابھی حال ہی میں بلوچستان میں رونما ہونے والے واقعات نے ہر شخص کو ایک مرتبہ پھر ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اگرچہ بلوچستان میں ماضی میں بھی متعدد بار ہمارے سیاست دانوں کی عاقبت نااندیشی اور ذاتی مفادات کی بنا پر بے چینی پیدا ہوئی، یہاں تک کہ بغاوت کی صورت بھی ظاہر ہوئی جس کو فرو کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا گیا، لیکن حال ہی میں اکبر بگٹی کی برسی کے موقع پر جس طرح بسوں سے اتار کر اور شناختی کارڈ چیک کر کے پنجاب کے لوگوں کو قتل کیا گیا، اس سے پنجاب کے بارے میں نفرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی موقع پر بلوچستان کا پاکستان سے زمینی راستہ بھی کاٹ دیا گیا۔ بموں کے دھماکے اور دوسری تخریبی سرگرمیاں اب معمول بن چکی ہیں۔ ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ کے جلسے و اجتماعات ٹھانڈے ہوئے سمندر کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں منگ پر سنز (لاپتہ افراد) کے حوالے سے بلوچستان کے دھرنے اب ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ دوسری جانب خیبر پختونخوا کا صوبہ ہے، جس کی بدامنی پچاس برس سے جاری ہے۔ گویا نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں۔ صد افسوس کہ یہ نصف صدی ہم دھماکوں اور تخریبی سرگرمیوں سے عبارت ہے، اگرچہ کچھ عرصہ گویا سانس لینے کے لیے کچھ کمی آجاتی ہے، یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر۔ اب تو پولیس بھی ریاستی اداروں کے بالمقابل کھڑی ہو گئی ہے اور تقریباً چار اضلاع میں ہڑتال پر چلی گئی ہے۔

سندھ بظاہر تو پُر سکون نظر آ رہا ہے لیکن سندھی نیشنل ازم کا پودا بھی ایک تناور درخت بن چکا ہے جس کے خمیر میں دین بیزاری اور مذہب بیزاری کا عنصر بھی شامل ہے۔ بہر حال تین نسلوں پر الحاد و ارتداد کی محنت و کوشش کا نتیجہ یہ ہے کہ سندھ کا نوجوان اور خاص کر تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک بہت بڑا حصہ دین و مذہب سے بیزار ہو کر الحاد و دہریت کی گود میں چلا گیا ہے۔

پنجاب جو آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے، کہنے کو تو یہ سب سے خوش حال صوبہ ہے جو دوسرے صوبوں کے نزدیک ان کے استحصال کا نتیجہ ہے۔ پھر یہ کہ سول ولٹری بیورو کریسی کی اکثریت کا تعلق پنجاب سے ہے اور یہ عدم توازن بھی دوسرے صوبوں کو پنجاب کے خلاف بھڑکانے کا ایک سبب ہے۔ دوسری طرف خود پنجاب میں بھی امن و امان کی صورت حال انتہائی مخدوش ہے اور کچے کے ڈاکوؤں نے پنجاب کے سکیورٹی اداروں کی پیشہ وارانہ استعداد کی قلعی کھول دی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ کچے کے ڈاکوؤں کا پکے کے ڈاکوؤں کے ساتھ جنٹلمین ایگریمنٹ (شریفانہ معاہدہ) ہے۔

اس پر مستزاد حکومت اور ریاستی اداروں کا اپوزیشن کے ساتھ جابرانہ طرز عمل ہے۔ پاکستان کی ہر سیاسی جماعت کو آئین اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے جلسوں کے انعقاد اور پُر امن احتجاج کا حق حاصل ہے لیکن پہلے جلے کو روکنا، اجازت کے بعد اس میں رکاوٹیں ڈالنا اور پھر اراکین پارلیمنٹ کو ایوان سے گرفتار کرنا بھی انتہائی تشویش ناک ہے۔ یہ ایک ایسی غلط روایت ہے جس سے فسطائیت کی بو آتی ہے۔

ملک کے تمام سیاست دانوں اور مقتدر حلقوں سے ہماری دست بستہ گزارش ہے کہ سب ہوش کے ناخن لیں اور ماضی کے تلخ تجربات سے سبق حاصل کریں۔ ایسی تمام سرگرمیوں اور کارروائیوں سے گریز کریں جن سے عوام ملک کے دیگر صوبوں اور علاقوں کے خلاف بھڑک اٹھیں۔ اس نازک وقت میں تمام سیاست دان اور مقتدر طبقات ملک کی خاطر اپنے اختلافات بھلا کر اکٹھے بیٹھ کر ایک لائحہ عمل طے کریں کہ ملکی سالمیت کو کس طرح محفوظ بنایا جاسکتا ہے۔ وفاقی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ملک کے دور دراز علاقوں کو احساس محرومی سے نکالنے کے لیے انہیں دیگر علاقوں کی طرح سہولیات فراہم کرے۔ ان علاقوں میں تعلیم، علاج اور روزگار کا مناسب انتظام کیا جائے۔ قدرتی وسائل میں ان کو پورا پورا حق دیا جائے۔ ان علاقوں میں

صنعتیں قائم کی جائیں تاکہ لوگوں کو روزگار ملے اور ان کا معیار زندگی بہتر ہو۔ یوں صوبائیت پرستی کا خاتمہ ممکن ہوگا اور ملک دشمن عناصر کو بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی عرض کیے دیتے ہیں کہ اگر چھوٹے چھوٹے صوبے بنا دیے جائیں یا ہر ڈویژن کو ایک صوبہ کا درجہ دے دیا جائے تو نہ صرف یہ انتظامی لحاظ سے زیادہ بہتر ہوگا بلکہ اس سے قوم پرستی اور صوبائی عصبیت کا خاتمہ کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ دنیا بھر میں انتظامی بنیادوں پر صوبے بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ یعنی اگر حکومت یہ محسوس کرے کہ کوئی صوبہ آبادی یا رقبے کے لحاظ سے بہت بڑا ہے اور انتظامیہ کے لیے اس کی دیکھ بھال مشکل ہو رہی ہے تو پھر کسی بھی صوبے کی تقسیم اور نئے صوبوں کی بنیاد رکھنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔ ضرورت کے مطابق ایسا کرنا فائدہ مند ہوتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی نے اپنے نظریات لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی تو مسائل نے جنم لیا اور کاروبار دنیا الجھتا گیا۔ خطہ زمین پر بسنے والے نہ صرف گروہوں میں بٹے بلکہ رنگ، نسل اور زبان کی بنیاد پر تقسیم ہو کر رہ گئے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا اللہ تعالیٰ کا یہ آخری اور حتمی کلام غالب ہونے کے لیے ہی آیا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس آئین پر ہی عمل کرتے ہوئے دنیا میں ایک ایسی حکومت قائم کی جاسکتی ہے جس میں رنگ و نسل اور لسانی بنیادوں پر انسانیت کی تقسیم نہ ہو بلکہ عدل ہو۔ وہ حکومت قائم ہو جس کا حاکم عوام کے سامنے جواب دہ ہو اور ان کا مسیحا ہو جس مملکت میں لوگ تعلیم سے محروم نہ ہوں۔ ایسا معاشرہ وجود میں آئے جہاں زکوٰۃ دینے والے تو ہوں مگر لینے والے نہ ہوں۔ ایسا معاشرہ قائم ہو جس میں طاقت و رکمزور پر ظلم نہ کر سکے۔ ایسے نظام حکومت کو دنیا نے خلافت راشدہ کے دور میں اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھا اور پرانے بھی اس کی برکتوں کے معترف ہوئے۔ لہذا مملکتِ خداداد پاکستان جو اسلام کے نام پر وجود میں آئی تھی اس کے جملہ مسائل کا حل صرف یہی ہے کہ ہم اپنی اصل کی طرف لوٹیں اور ملک کو صحیح معنوں میں ایک اسلامی فلاحی ریاست بنائیں۔ اس راستے کا انتخاب کیا جائے جس پر چل کر دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو جاسکے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ تمام صاحبان حل و عقد اور فیصلہ کی مسند پر بیٹھے تمام افراد کو ہدایت عطا فرمائے اور ملک و قوم کے حوالے سے صحیح فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ❀❀❀

## سُورَةُ التِّينِ

### تمہیدی کلمات

سورۃ التین میں انسانی زندگی کے نفسیاتی اور فلسفیانہ پہلو سے متعلق اہم حقائق بیان ہوئے ہیں۔ بنیادی طور پر اس سورت کا مضمون چونکہ انسان کی تخلیق سے متعلق ہے اس لیے اسے سمجھنے کے لیے نفسِ انسانی کی تخلیق کے بارے میں سورۃ الشمس کی آیت ﴿فَالْهَمُّهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی نفس کے بارے میں یہ حقیقت واضح فرمادی ہے کہ اس میں نیکی اور بدی کی تیز لہام کر دی گئی ہے۔ اب اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ ایک ایسے انسان کا تصور کریں جس کی اخلاقی حس پوری طرح فعال و بیدار ہے۔ ایسا انسان جب ایک بگڑے ہوئے معاشرے کو دیکھتا ہے (بد قسمتی سے آج ہمارا معاشرہ اجتماعی رگاڑ کا مثالی نقشہ پیش کرتا ہے) تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاید انسان بنیادی طور پر بہت گھٹیا اور گندی مخلوق ہے، اور یہ کہ شاید اس میں خیر نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ اسی وجہ سے دور جدید کے تقریباً تمام ماہرینِ نفسیات اس نکتے پر متفق ہیں کہ انسان کے اندر حیوانی داعیات یعنی پیٹ اور شہوت کے تقاضوں اور حُبِ تفوق (urge to dominate) کے علاوہ اور کوئی حس یا داعیہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ صورت حال ایک حساس انسان کے لیے یقیناً بہت مایوس کن ہے۔ لیکن اس کے برعکس یہ سورت ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ انسان صرف شر کا پتلا اور گناہ کی پوٹلی ہی نہیں ہے بلکہ اس میں بہت اعلیٰ بلندیوں کو چھونے کی صلاحیت بھی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالتِّينِ وَ الزَّيْتُونِ ۝ وَ طُورِ سِیْنِیْنَ ۝ وَ هَذَا الْبَلَدِ  
الْأَمِیْنِ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِیْ أَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ

أَسْفَلَ سَفْلِیْنِ ۝ إِلَّا الذِّیْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ  
أَجْرٌ عَزِیْزٌ مَّمْنُونٌ ۝ فَمَا یُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالذِّیْنِ ۝ أَلْیْسَ اللّٰهُ  
بِأَحْكَمِ الْحَكِیْمِ ۝

آیت ۱ ﴿وَالتِّينِ وَ الزَّيْتُونِ ۝﴾ ”گواہ ہے انجیر اور گواہ ہے زیتون۔“

آیت ۲ ﴿وَ طُورِ سِیْنِیْنَ ۝﴾ ”اور گواہ ہے طور سینا۔“

آیت ۳ ﴿وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِیْنِ ۝﴾ ”اور گواہ ہے یہ امن والا شہر۔“

التین کے معنی انجیر کے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قومِ نوح کے علاقے میں ایک بڑے پہاڑ کا نام بھی جبل التین تھا اور یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اسی پہاڑ کے دامن میں ساڑھے نو سو سال تک دعوت و تبلیغ کے فرائض سرانجام دیے۔ اسی طرح الزیتون سے مراد زیتون کا پھل اور درخت بھی ہے اور وہ پہاڑی بھی جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اکثر تبلیغی خطبات دیا کرتے تھے۔ ان خطبات میں سے آپ کا ایک خطبہ ”پہاڑی کے وعظ“ (Sermon of the Mount) کے نام سے خاص طور پر مشہور ہے۔ تیسری قسم (وَ طُورِ سِیْنِیْنَ) کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات سے ہے۔ کوہ طور پر آپ کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا۔ اور امن والے شہر سے مکہ مکرمہ مراد ہے جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کے نزول کے وقت دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔

گویا ان آیات میں جن مقامات کی قسمیں کھائی گئی ہیں ان میں سے ہر مقام کا تعلق ایک جلیل القدر شخصیت سے ہے۔ گویا ان شخصیات کو گواہ بنا کر یہاں اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ بنیادی طور پر انسان بہت بلند مرتبت اور صاحبِ عزت و عظمت مخلوق ہے۔ اگر کسی کو اس حقیقت کے بارے میں کوئی شک ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے بندے نوح علیہ السلام کی زندگی کے شب و روز کا تصور کرے۔ اُس کے بندے عیسیٰ علیہ السلام کے کردار کا نقشہ ذہن میں لائے، موسیٰ علیہ السلام کی عظیم المرتبت شخصیت کو یاد کرے اور پھر سب سے بڑھ کر اُس کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثال سیرت کا نمونہ دیکھے۔ یہ شخصیات ان کے کردار اور ان کی سیرتیں اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ:

آیت ۴ ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِیْ أَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝﴾ ”ہم نے انسان کو بہترین

ساخت پر پیدا کیا۔“

ہم نے تو انسان کو اشرف المخلوقات کے اعلیٰ مرتبے پر فائز کیا تھا: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيَّ  
آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ  
خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾ (بنی اسرائیل) ”اور ہم نے بڑی عزت بخشی ہے اولادِ آدم کو اور ہم  
اٹھائے پھرتے ہیں انہیں خشکی اور سمندر میں اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا اور  
انہیں فضیلت دی اپنی بہت سی مخلوق پر بہت بڑی فضیلت“۔ نسلِ انسانی کی عزت و تکریم کی انتہا یہ  
ہے کہ ان کے جدِ امجد کو ہم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تخلیق کیا (ص: ۷۵) اور موجود ملائکہ بنایا۔

اگر تمہیں یہ دنیا ظالموں، بدکاروں اور گھٹیا انسانوں سے بھری نظر آتی ہے تو اللہ نے بھی  
تمہارے سامنے اپنے ایسے چار بندوں کی مثالیں پیش کر دی ہیں جو عظمتِ انسانی کے زندہ و جاوید  
ثبوت ہیں۔ کیا ان مثالوں کو دیکھنے کے بعد بھی کوئی عقل کا اندھا یہ دعویٰ کرے گا کہ انسان کے  
اندر خیر اور عظمت کا کوئی پہلو سرے سے موجود ہی نہیں؟ بہر حال اگر کوئی شخص عظمت کے ان  
بیناروں کو دیکھ لینے کے بعد بھی انسانی عظمت کا قائل نہ ہو اور اس عظمت و اکرام کو پانے کے لیے  
اپنا رخ تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرے تو یقیناً اس کا شمار نسلِ انسانی کے ان افراد میں ہوگا  
جو شرفِ انسانیت سے نیچے گر کر حیوانوں سے بھی بدتر ہو چکے ہیں: ﴿أُولَئِكَ كَانُوا لَنَا عَادِلًا لَّيْسَ لَهُمْ  
أَصْلٌ﴾ (الاعراف: ۱۷۹)

**آیت ۱۷۹** ﴿ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ﴾ ”پھر ہم نے لوٹا دیا اس کو پست ترین  
حالت کی طرف۔“

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی اس عظیم المرتبت مخلوق (کی روح) کو اس کے جسدِ خاکی میں بٹھا کر  
نیچے دنیا میں بھیج دیا۔ لیکن واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر جہالت کی تاریکی میں نہیں  
بلکہ ہدایت کے اُجالے میں بھیجا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے کامیابی اور ناکامی کے راستوں کا شعور  
بھی عطا کیا، اس کی فطرت میں نیکی و بدی کی تمیز بھی ودیعت کی اور وقتاً فوقتاً وہ براہِ راست ہدایات  
بھی بھیجتا رہا: ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ﴾ (الحشر: ۱۹) کہ  
تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو فراموش کر دیا اور اس کی پاداش میں اللہ نے انہیں  
اپنے آپ سے ہی غافل کر دیا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اب  
اگر وہ اپنے شرفِ انسانی کو بھلا کر محض حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا رہے اور خود کو حیوان ہی سمجھتا رہے  
ماہنامہ میثاق (11) اکتوبر 2024ء

تو یہ اس کی مرضی ہے۔

اس فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنی سرشت (حیوانی وجود کے تقاضوں) کے اعتبار سے انسان  
میں کچھ کمزوریاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں، لیکن اپنی فطرت (روح) کے لحاظ سے یہ بہت اعلیٰ  
اور عظیم المرتبت مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی روح کو اس کے حیوانی جسم میں متمکن فرما کر  
اسے دنیا میں بھیجا تو اس کا ارفع و اعلیٰ روحانی وجود اس کے حیوانی جسم میں قید ہو کر گویا اسفل (چٹلی)  
مخلوق کی سطح پر آ گیا۔ چنانچہ دنیوی زندگی میں اس کے سامنے اصل ہدف یہ ہے کہ وہ اپنے شعور اور  
اللہ تعالیٰ کی فراہم کردہ ہدایت کے مطابق راستہ اختیار کرے، اس راستے کے تقاضے پورے کرنے  
کے لیے محنت کرے اور اسفل سطح سے اوپر اٹھ کر اپنی اصل عظمت اور حقیقی منزل کو دوبارہ حاصل  
کرنے کی کوشش کرے۔

اب اگلی آیت میں اس راستے کی نشاندہی اور مطلوبہ محنت کے طریقے کی وضاحت کی گئی ہے:  
**آیت ۱۸۰** ﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ ”سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان  
لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے“

اب مذکورہ پستی سے صرف وہی لوگ نکل پائیں گے جو اپنے شعور و حواس سے کام لیتے  
ہوئے اپنے خالق اور معبود کو پہچانیں گے یعنی اُس پر ایمان لائیں گے اور پھر محنت کر کے اپنے  
کردار و عمل کو اُس کی منشاء و مرضی کے مطابق ڈھالیں گے، یعنی اعمالِ صالحہ کا اہتمام کریں گے۔  
﴿فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ﴾ ”تو اُن کے لیے ایسا اجر ہوگا جس کا سلسلہ کبھی  
منقطع نہیں ہوگا۔“

**آیت ۱۸۱** ﴿فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالذِّينِ﴾ ”تو اس کے بعد کیا چیز تجھے آمادہ کرتی ہے  
جز اوسز کے انکار پر؟“

تو اے جزاوسز کے منکر انسان! جب تو خود دیکھ رہا ہے کہ دنیا میں تمام انسان ایک جیسے نہیں  
ہیں، ان میں کچھ بہت اعلیٰ سیرت و کردار کے مالک ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو انسانیت کے ماتھے  
پر بدنماداغ کی حیثیت رکھتے ہیں، تو اس صورت حال میں کیا عقل اور انصاف کا تقاضا یہ نہیں ہے  
کہ اچھوں کو اُن کی اچھائی اور محنت کا پھل ملے اور بُروں کو اُن کی بُرائی اور نافرمانی کی سزا دی  
جائے؟ یہ ایسی سیدھی سادی بات ہے جو عام ذہنی سطح کا ایک انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ تو یہ سب کچھ  
ماہنامہ میثاق (12) اکتوبر 2024ء

دیکھنے، سننے اور سمجھنے کے بعد بھی آخر وہ کون سی منطق ہے جس کے تحت تم جزا و سزا کے انکار پر جے ہوئے ہو؟

**آیت ۸** ﴿الَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَكِيمِينَ ۝﴾ ”کیا اللہ تمام حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟“

دنیا میں تم لوگ چھوٹے چھوٹے حاکموں کو دیکھتے ہو کہ وہ اپنے غداروں اور باغیوں کو عبرت ناک سزا دیتے ہیں اور اپنے وفاداروں کو انعام و اکرام سے نوازتے ہیں۔ کیا دنیا میں تم نے کوئی ایسا حاکم بھی دیکھا ہے جو اپنے باغیوں اور وفاداروں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دے؟ اگر دنیا میں محدود اختیار کا مالک کوئی حاکم ایسا نہیں کرتا تو وہ اللہ عزوجل اپنے فرمانبردار بندوں اور نافرمانوں کو کیسے برابر کر دے گا جو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے؟ کیا تم اللہ تعالیٰ کو حکم الحاکمین نہیں مانتے ہو؟

مسند احمد، سنن الترمذی، سنن ابی داؤد اور دیگر کتب حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی سورۃ التین پڑھے اور اَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَكِيمِينَ پر پہنچے تو کہے: بلی وانا علی ذلک من الشاہدین ”کیوں نہیں! اور میں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں“۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ آیت پڑھتے تو فرماتے: سُبْحَانَكَ فَبَلِي! ﴿۸﴾ ﴿۹﴾

## سُورَةُ الْعَلَقِ

### تمہیدی کلمات

سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات کے بارے میں تمام مفسرین متفق ہیں کہ غارِ حرا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی آئی تھی وہ ان آیات پر مشتمل تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی۔ رات کو آپ جو خواب دیکھتے، دن کو اس کی تعبیر ہو، وہی سامنے آ جاتی۔ پھر آپ غلوت گزینی کی طرف مائل ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب آپ کئی کئی راتوں تک غارِ حرا میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ ماہنامہ **میثاق** (13) اکتوبر 2024ء

فرماتی ہیں: فَيَتَحَنَّنُ فِيهِ لِعِنِي غَارِ حِرَاءِ مِثْلِ عِبَادَتِ كَيْفَا كَرْتِي تَحْتِي۔ غارِ حرا کی خلوت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کی نوعیت کیا تھی اس بارے میں تمام شارحین حدیث کا اجماع ہے کہ وہاں پر آپ اپنا وقت غور و فکر اور سوچ بچار (التفکر والاعتبار) میں گزارتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں مصروف ذکر و فکر تھے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور آپ سے کہا: اقْرَأْ کہ پڑھئے۔ آپ نے فرمایا: مَا اَنَا بِقَارِئٍ كَيْفَا تَوَظَّرْتَا هُوَا نَمِيں ہوں۔ اس پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سینے سے لگا کر بھینچا اور پھر پڑھنے کو کہا۔ آپ نے پھر فرمایا: مَا اَنَا بِقَارِئٍ۔ حضرت جبرائیل نے پھر وہی عمل دہرایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی جواب دیا۔ حتیٰ کہ جب حضرت جبرائیل نے تیسری مرتبہ آپ کو بھینچنے کے بعد فرمایا: ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝۱... الخ﴾ تو مذکورہ آیات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر جاری ہو گئیں۔ اس حوالے سے مجھے اس روایت سے اتفاق ہے کہ اس وحی کے نزول کے وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ کے پاس سونے کی ایک تختی لے کر آئے تھے جس پر یہ آیات لکھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے اگر حضرت جبرائیل نے آپ کو زبانی پڑھانا ہوتا تو آپ یقیناً مذکورہ جواب نہ دیتے۔ یعنی ضرور آپ کے سامنے کوئی ایسی چیز آئی تھی جسے دیکھ کر پڑھنا تھا۔ تبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا اَنَا بِقَارِئٍ۔

اس وحی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس موقع پر حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی اصلی ملکی شکل میں آئے تھے۔ اُس وقت اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نیم بیداری اور نیم خوابیدگی کی کیفیت میں تھے، لیکن آپ نے حضرت جبرائیل کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ایک طویل وقفے (فترت وحی) کے بعد چوتھی وحی کے نزول کے موقع پر حضرت جبرائیل آپ کو افاق پر نظر آئے (اس واقعہ کی تفصیل سورۃ المدثر کے تمہیدی کلمات میں بیان ہو چکی ہے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو قبل ازیں میرے پاس غارِ حرا میں آیا تھا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝

ماہنامہ **میثاق** (14) اکتوبر 2024ء

اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ﴿١﴾ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿٢﴾ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴿٣﴾ كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَّاظٍ ﴿٤﴾ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ ﴿٥﴾ أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ ﴿٦﴾ أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَىٰ الْهُدَىٰ ﴿٧﴾ أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَىٰ ﴿٨﴾ أَرَأَيْتَ إِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴿٩﴾ أَلَمْ يَعْلَم بِأَنَّ اللَّهَ يَرَىٰ ﴿١٠﴾ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهَ ﴿١١﴾ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ﴿١٢﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿١٣﴾ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ﴿١٤﴾ سَدَّعُ الرَّبَّانِيَّةِ ﴿١٥﴾ كَلَّا لَا تَطْعَهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿١٦﴾

**آیت ۱** ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ﴿١﴾﴾ ”پڑھیے اپنے اُس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔“

**آیت ۲** ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴿٢﴾﴾ ”انسان کو پیدا کیا ہے اُس جو تک کی طرح کی چیز سے جو رحم مادر میں چمٹ گئی تھی۔“

**آیت ۳** ﴿اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ﴿٣﴾﴾ ”پڑھیے اور آپ کا رب بہت کریم ہے۔“

**آیت ۴** ﴿الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿٤﴾﴾ ”جس نے تعلیم دی ہے قلم کے ساتھ۔“

گویا عام انسانی تعلیم کا ذریعہ قلم ہے جبکہ حضور ﷺ کی تعلیم کے لیے فرشتہ مقرر ہوا۔

**آیت ۵** ﴿عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴿٥﴾﴾ ”اور انسان کو وہ کچھ سکھایا ہے جو وہ نہیں جانتا تھا۔“

پہلی وحی ان پانچ آیات پر مشتمل تھی۔ اس وحی میں حضور ﷺ کو تبلیغ و انذار سے متعلق کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ البتہ اس وحی کی خاص اہمیت یہ ہے کہ اس سے آپ کی نبوت کا ظہور ہوا (ہر نبی اگرچہ پیدائشی طور پر ہی نبی ہوتا ہے لیکن اس کی نبوت کا باقاعدہ ظہور پہلی وحی کے وقت ہوتا ہے)۔ تبلیغ کا باقاعدہ حکم آپ کو سورۃ المدثر کی ان آیات میں دیا گیا: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿١﴾ قُمْ فَأَنذِرْ ﴿٢﴾ وَرَبُّكَ فَكَابِرٌ ﴿٣﴾﴾ کہ اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (صلی اللہ علیہ وسلم) کھڑے ہو جاؤ اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرو۔ یعنی اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اب آپ اللہ تعالیٰ کی کبریائی کو

عملی طور پر نافذ کرنے کے لیے جذبہ جہد شروع کر دیجیے۔ سورۃ العلق اور سورۃ المدثر کے مابین اس لحاظ سے گہری مشابہت پائی جاتی ہے کہ سورۃ المدثر کی طرح یہ سورت بھی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پھر جس طرح سورۃ المدثر کی پہلی سات آیات میں حضور ﷺ سے خطاب کے بعد تین آیات میں قیامت کا ذکر آیا ہے بالکل اسی طرح اس سورت میں بھی پہلی پانچ آیات میں حضور ﷺ سے خطاب ہے اور اس کے بعد درج ذیل تین آیات میں آخرت کا فلسفہ بیان ہوا ہے۔

**آیت ۶** ﴿كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِكَيْطَلِي ﴿٦﴾﴾ ”کوئی نہیں! انسان سرکشی پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے۔“

انسان سرکشی اور ظلم و زیادتی پر کیوں اتر آتا ہے؟ اس کی وجہ اگلی آیت میں بتائی گئی:

**آیت ۷** ﴿أَن رَّأَاهُ اسْتَغْنَىٰ ﴿٧﴾﴾ ”اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے۔“

وہ دیکھتا ہے کہ اس پر کوئی پکڑ نہیں۔ دنیا میں نہ تو ظالم کو اُس کے ظلم کی قرار واقعی سزا ملتی ہے اور نہ ہی مظلوم کی کماحقہ دادرسی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس دنیا کا نظام محض طبعی قوانین و ضوابط (physical laws) کے مطابق چل رہا ہے اور یہ کہ یہاں اخلاقی قوانین (moral laws) کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ انسان کی روزمرہ زندگی کا تجربہ بھی اُسے یہی بتاتا ہے کہ زہر کھانے سے تو آدمی ہلاک ہو جاتا ہے لیکن حرام کھانے سے اُسے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب معاشرے کے عام آدمی کو نیکی، انصاف، دیانت داری جیسے الفاظ عملی طور پر بے معنی اور بے وقعت نظر آتے ہیں تو وہ سرکشی اور من مرضی کے راستے پر چل نکلتا ہے۔ اب اگلی آیت میں انسان کی اس سرکشی اور بغاوت کا علاج بتایا جا رہا ہے۔ اس کا علاج اس یاد دہانی میں ہے کہ:

**آیت ۸** ﴿إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ ﴿٨﴾﴾ ”یقیناً تجھے اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

گویا انسان کو راہ راست پر رکھنے کا جو مؤثر ترین علاج ہے وہ ہے عقیدہ آخرت پر پختہ یقین۔ یعنی یہ یقین کہ ایک دن اُسے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہو کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے اور وہ عدالت بھی ایسی ہے جہاں ذرہ برابر بھی کوئی چیز چھپائی نہیں جاسکے گی: ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ﴿٤﴾ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ﴿٥﴾﴾



(الزلزال) ”جس کسی نے ذرے کے ہم وزن نیکی کمائی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس کسی نے ذرے کے ہم وزن برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا“۔ گویا یہ عقیدہ آخرت پر پختہ یقین اور قیامت کے دن کی پیشی کا خوف ہی ہے جو انسان کے اندر خود احتسابی کا احساس اُجاگر کرتا ہے۔ یہی یقین اور خوف اسے خلوت و جلوت میں اُندھیرے اُجالے میں اور ہر جگہ ہر حال میں غلط روی اور ظلم و تعدی کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے۔ ورنہ انسان کی سرشت ایسی ہے کہ جس مفاد تک اس کا ہاتھ پہنچتا ہوا سے سمیٹنے کے لیے وہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی حدود کی پروا نہیں کرتا۔

اب اگلی آیت سے اس سورت کا تیسرا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ سورۃ المدثر کے ساتھ اس سورت کے مضامین کی مشابہت کا انداز ملاحظہ ہو کہ سورۃ المدثر کے تیسرے حصے میں ولید بن مغیرہ کے کردار کی جھلک دکھائی گئی ہے جبکہ یہاں اس کے مقابل ابو جہل کے طرز عمل کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

**آیت ۹:** ﴿أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ﴾ ”کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جو روکتا ہے۔“

**آیت ۱۰:** ﴿عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ﴾ ”(ہمارے) ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔“

یہ اشارہ ہے ابو جہل کی ان جسارت آمیز حرکات کی طرف جو وہ حضور ﷺ کو نماز سے روکنے کے لیے کیا کرتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ ابو جہل نے آپ کو دیکھا تو اونٹ کی اوجھڑی منگوا کر عین سجدے کی حالت میں آپ کی پشت مبارک پر رکھوا دی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ابھی بچی تھیں ان کو پتا چلا تو آپ گھر سے بھاگ بھاگ حرم میں پہنچیں اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس غلاظت کو آپ کے اوپر سے ہٹایا۔ اسی طرح ایک اور موقع پر ابو جہل نے آپ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھ کر آپ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اس قدر زور سے مروڑا کہ آپ کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ حضور ﷺ کے سفر طائف سے واپسی کے زمانے میں بھی پیش آیا۔ اس واقعہ کی تفصیل روایات میں یوں آتی ہے کہ ابو جہل نے لات اور عزیٰ کی قسم کھا کر کہا تھا کہ اگر اس نے پھر محمد ﷺ کو اس طرح نماز پڑھتے دیکھا تو اُن کی گردن روند ڈالوں گا اور اُن کا منہ خاک آلود کر دوں گا۔ ایک دن اُس نے آپ ﷺ کو حرم میں نماز پڑھتے دیکھا تو غصے میں آپ کو ڈانٹتے ہوئے آپ کی طرف بڑھاتا کہ اپنی قسم پوری کرے، مگر پھر یکدم دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ لوگوں نے پوچھا کیا

ماہنامہ میناق (17) اکتوبر 2024ء

ہوا؟ کیوں پیچھے ہٹ آئے؟ کہنے لگا کہ آگے بڑھنے پر مجھے اپنے اور محمد ﷺ کے درمیان حائل آگ سے بھری ہوئی ایک خندق اور ایک پروں والی کوئی مخلوق دکھائی دی جو میری تگمہ بوٹی کرنے کو تیار تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب پھٹتا تو فرشتے اس کے چپٹھڑے اڑا دیتے۔ یہاں یہ نکتہ لائق توجہ ہے کہ پہلے دونوں واقعات کے حوالے سے ابو جہل کو ایسے کسی غیر معمولی یا غیر مرئی رد عمل کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ میرے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ پہلے دونوں واقعات کے زمانے میں حضور ﷺ کی پشت پناہی کے لیے دنیوی اسباب کے طور پر جناب ابوطالب موجود تھے جبکہ تیسرا واقعہ اس زمانے میں پیش آیا جب یہ دنیوی سہارا بھی موجود نہ رہا اور اب حضور ﷺ کی حفاظت براہ راست اللہ تعالیٰ خود فرما رہا تھا۔ اس لیے اس وقت غیبی مدد کے ذریعے حضور ﷺ کی حفاظت کو یقینی بنا یا گیا۔ آیات زیر مطالعہ میں خاص طور پر اسی واقعہ کا تذکرہ ہے۔

**آیت ۱۱:** ﴿أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَىٰ الْهُدَىٰ﴾ ”کیا تم نے غور کیا اگر وہ شخص ہدایت پر ہوتا؟“

**آیت ۱۲:** ﴿أَوْ أَمَرَ بِالْتَّقْوَىٰ﴾ ”یا وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا!“

جیسا کہ سورۃ اللیل کی آیت ۱۰ کے ضمن میں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ ابو جہل کے کردار میں بہت سی مثبت خصوصیات بھی پائی جاتی تھیں۔ مثلاً وہ مال خرچ کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ صاف گو بھی تھا۔ اپنے ایمان نہ لانے کی وجہ بتاتے ہوئے اس نے بالکل کھری اور سچی بات کہی تھی کہ میں محمد ﷺ کو جھوٹا نہیں سمجھتا، لیکن ہمارے خاندان نے چونکہ غر باء کو کھانے کھلانے اور حاجیوں کی خدمت کرنے میں ہمیشہ بنو ہاشم کا مقابلہ کیا ہے اس لیے اب میں محمد ﷺ کی نبوت کی شہادت دے کر اپنے حریف خاندان کی بڑائی تسلیم نہیں کر سکتا۔ وہ جری اور بہادر ایسا تھا کہ نزع کے وقت بھی اُس نے ہار نہیں مانی اور میدان بدر میں اپنا سر قلم کرنے والے شخص کو مخاطب کر کے یہ کہنا ضروری سمجھا کہ اس کی گردن کو ذرا نیچے سے کاٹا جائے تاکہ سر نیچے پر چڑھے تو اونچا نظر آئے۔ بہر حال شخصی اعتبار سے وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرح بہادر، نڈر، بے باک اور صاف گو انسان تھا۔ اگر وہ ایمان لے آتا تو یقیناً حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کی طرح اعلیٰ پائے کا مسلمان ہوتا۔ لیکن جب وہ ﴿صَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ﴾ (اللیل) یعنی تصدیق حق کی گھاٹی

ماہنامہ میناق (18) اکتوبر 2024ء

عبور کرنے میں ناکام رہا تو اُس کے کردار کی بہت سی مثبت خصوصیات بھی اس کے کسی کام نہ آسکیں۔

**آیت ۱۲** ﴿أَرَأَيْتَ إِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۖ﴾ ”کیا تم نے سوچا کہ اس نے جو جھٹلایا ہے اور منہ موڑ لیا ہے۔“

**آیت ۱۳** ﴿أَلَمْ يَعْلَم بِأَنَّ اللَّهَ يَرَىٰ ۖ﴾ ”کیا یہ جانتا نہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے!“

**آیت ۱۴** ﴿كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۖ﴾ ”ہرگز نہیں! اگر یہ باز نہ آیا“

﴿لَنْسَفَعًا بِالْغَاصِيَةِ ۖ﴾ ”تو ہم گھسیٹیں گے اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر۔“

**آیت ۱۵** ﴿نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۖ﴾ ”وہ پیشانی کہ جو خطا کا رہے جھوٹی ہے۔“

**آیت ۱۶** ﴿فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۖ﴾ ”تو وہ بلا لے اپنی مجلس کے لوگوں کو۔“

**آیت ۱۷** ﴿سَدِّدْ عُرْزَابِنِيَّةٍ ۖ﴾ ”ہم بھی بلا لیں گے جہنم کے فرشتوں کو۔“

**آیت ۱۸** ﴿كَلَّا لَا تَطَّعُهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۖ﴾ ”کوئی بات نہیں! (اے نبی ﷺ) آپ اس کی بات نہ مانیں“ آپ سجدہ کیجیے اور (اللہ سے اور) قریب ہو جائیں!“

آپ ﷺ اس جھوٹے غلط کار شخص کی ایک نہ سینے۔ یہ اگر آپ کو نماز پڑھنے سے منع کرتا ہے تو اس کی پروا نہ کیجیے۔ آپ اپنے پروردگار کی جناب میں سجدے کرتے رہیے اور کثرتِ سجود سے اُس کا قرب حاصل کرتے رہیے۔ ❀❀❀

## سُورَةُ الْقَدْرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۖ وَ مَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ  
الْقَدْرِ ۖ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۖ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۖ تَنزِيلُ الْكِتَابِ  
وَ الرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۖ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ۖ سَلَّمَ ۗ هِيَ حَتَّى  
مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۖ

**آیت ۱** ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۖ﴾ ”یقیناً ہم نے اتارا ہے اس (قرآن) کو لیلۃ القدر میں۔“

”اَنْزَلْنَاهُ“ کی ضمیر مفعولی کا مرجع بالاتفاق قرآن مجید ہی ہے۔ نوٹ کیجیے! ان سورتوں کے مضامین کے اندر ایک ربط پایا جاتا ہے، یعنی پہلی وحی (سورۃ العلق) کے فوراً بعد بتایا جا رہا ہے کہ ہم نے اس کلام کو لیلۃ القدر میں نازل فرمایا ہے۔ قدر کا معنی تقدیر اور قسمت بھی ہے اور عزت و منزلت بھی۔ یہاں دونوں معنی مراد لیے جاسکتے ہیں۔ یعنی ہم نے اس قرآن کو اس رات میں اتارا ہے جو قدر و منزلت کے اعتبار سے بے مثل رات ہے یا اس رات میں اتارا ہے جو تقدیر ساز ہے۔ سورۃ الدخان میں اس رات کا ذکر لیلۃ مُبَارَكَةٍ کے نام سے آیا ہے: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبْرَكَةٍ﴾ (آیت ۳) ”یقیناً ہم نے نازل کیا ہے اس (قرآن) کو ایک مبارک رات میں“۔ یہ کونسی رات ہے؟ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (تَحْرَوْنَا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوَيْلِ مِنَ الْعَشْرِ الْآخِرِ مِنْ رَمَضَانَ) (۱) ”لیلۃ القدر کو رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو“۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ ستائیسویں رمضان کی شب ہی لیلۃ القدر ہے۔ لیکن جیسا کہ سورۃ الفجر کی آیت ۳ کے ضمن میں بھی وضاحت کی جا چکی ہے، قمری کیلنڈر کی طاق اور جفت راتوں کی گنتی دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً آج ہمارے ہاں جو طاق رات ہے سعودی عرب میں ممکن ہے وہ جفت رات ہو۔ اس لیے لیلۃ القدر کو تلاش کرنے کا محتاط طریقہ یہی ہے کہ اسے رمضان کے آخری عشرے کی تمام راتوں (جفت اور طاق دونوں) میں تلاش کیا جائے۔ اور اگر واقعی ستائیسویں رمضان کی شب ہی لیلۃ القدر ہے تو اس بارے میں میرا اپنا خیال یہ ہے کہ پھر یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی ستائیسویں شب ہے۔ واللہ اعلم!

اس رات میں قرآن نازل کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس رات کو پورا قرآن مجید لوح محفوظ سے حاملین وحی فرشتوں کے سپرد کر دیا گیا اور پھر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ۲۳ سال کے دوران میں حضرت جبرائیل علیہ السلام اس کی آیات اور سورتیں رسول اللہ ﷺ پر نازل

۱۔ صحیح البخاری، کتاب صلاة التراويح، باب تحری لیلۃ القدر فی الوتر من العشر الاواخر۔ و صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب فضل لیلۃ القدر...

کرتے رہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے نزول کی ابتدا اس رات سے ہوئی۔

**آیت ۲۰** ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۚ﴾ ”اور تم کیا جانتے ہو کہ لیلۃ القدر کیا ہے!“  
اس استغنام سے اس رات کی عظمت و اہمیت واضح ہوتی ہے۔ گویا مخلوق اس کی تہ تک پوری طرح نہیں پہنچ سکتی، صرف اللہ جل جلالہ ہی اس کی قدر و منزلت کو پوری طرح جانتا ہے۔  
**آیت ۲۱** ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۚ حَيِّضٌ مِّنَ أَلْفِ شَهْرٍ ۚ﴾ ”لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔“

یہ بہتری اور افضلیت کس اعتبار سے ہے؟ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس رات کا عمل خیر ہزار مہینوں کے عمل خیر سے بہتر ہے جس میں لیلۃ القدر نہ ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ)) (۲) ”جو شخص لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور اللہ سے اجر کی امید میں کھڑا رہا اُس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے۔“ اس رات کی افضلیت کے ضمن میں ایک رائے یہ ہے کہ اس ایک رات میں اتنی خیر تقسیم کی جاتی ہے جتنی ایک ہزار مہینہ میں بھی تقسیم نہیں کی جاتی۔ اس رات کی افضلیت کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کی اصلاح اور فلاح کے لیے جو کام (نزول قرآن) اس ایک رات میں ہوا خیر اور بھلائی کا اتنا بڑا کام کبھی انسانی تاریخ کے کسی طویل زمانے میں بھی نہ ہوا تھا۔ واضح رہے کہ اہل عرب بڑی کثیر تعداد کا تصور دلانے کے لیے اَلْف (ہزار) کا لفظ بولتے تھے۔

**آیت ۲۲** ﴿تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ أَمْرٍ ۚ﴾ ”(اس رات میں) اُترتے ہیں فرشتے اور روح اپنے رب کے حکم سے ہر کام کے لیے۔“  
روح سے مراد یہاں روح الامین یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ حضرت جبرائیل فرشتوں کے سردار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں انہیں خصوصی مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ جیسا کہ سورۃ التکویر میں فرمایا گیا: ﴿ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۚ ۲۰ مُطَاعٌ ۚ ۲۱ ثُمَّ أَمِينٌ ۚ ۲۱﴾ ”وہ (جبرائیل)“

۲۔ صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب من صام رمضان ایانا واحسابا ونیة۔ و صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب الترغيب في قيام رمضان وهو التراويح۔

بہت قوت والا ہے، صاحب عرش کے قرب میں اس کا ٹھکانہ ہے۔ اس کی اطاعت کی جاتی ہے اور وہاں وہ امانت دار بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں حضرت جبرائیل علیہ السلام اور فرشتوں کا ذکر آتا ہے تو ان (حضرت جبرائیل) کا ذکر عام طور پر علیحدہ کیا جاتا ہے۔

لیلۃ القدر میں حضرت جبرائیل علیہ السلام اور فرشتوں کا خصوصی نزول دراصل اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کے حوالے سے ہوتا ہے۔ سورۃ الدخان میں لیلۃ القدر یا لیلۃ مبارکہ کے بارے میں ایک خصوصی بات یہ بتائی گئی ہے: ﴿فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ۚ ۴﴾ کہ اس رات میں تمام پُر حکمت امور کے فیصلے صادر کیے جاتے ہیں۔ (اسی لیے اسے ”لیلۃ الحُکْمِ“ بھی کہتے ہیں) سورۃ الدخان کے مطالعے کے دوران اس آیت کے تحت اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ مختصراً یہ کہ لیلۃ القدر اللہ تعالیٰ کی تکوینی سلطنت سے متعلق فیصلوں کے لیے سالانہ بجٹ سیشن کا درجہ رکھتی ہے۔ اس رات میں اگلے سال کے لیے تمام اہم امور کے فیصلے کر کے تعمیل و تنفیذ کی غرض سے فرشتوں کے حوالے کر دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرشتے حضرت جبرائیل کی قیادت میں ان احکامات پر عمل درآمد کے لیے پوری زمین میں پھیل جاتے ہیں۔ نظام کائنات سے متعلق اللہ تعالیٰ کی اس ”تدبیر امر“ کا ذکر سورۃ السجدۃ کی اس آیت میں بھی آیا ہے: ﴿يُنزِّلُ الْأَمْزِجَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ ۚ﴾ (آیت ۵) ”وہ تدبیر کرتا ہے اپنے امر کی آسمان سے زمین کی طرف، پھر وہ (امر) چڑھتا ہے اُس کی طرف۔“ گویا اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل کے بعد متعلقہ فرشتے تکمیلی رپورٹیں بھی بھیجتے ہیں۔

**آیت ۲۳** ﴿سَلَامٌ ۚ﴾ ”سراسر سلامتی ہے۔“

اس سلامتی کے بہت سے پہلو ہیں۔ مثلاً اس رات میں لوگوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور عبادت کا ثواب کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

﴿هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۚ﴾ ”(یہ رات) رہتی ہے طلوع فجر تک۔“ ❀❀❀

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر  
”بیان القرآن“ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں  
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

## فتنہ قادیانیت: زوال کا آغاز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

[ ستمبر ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت قرار دیے جانے کے

بعد ”میثاق“ اکتوبر/نومبر ۱۹۷۴ء کا ادارہ ]

جس وقت ”میثاق“ کا یہ شمارہ طبع ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا، اُس وقت تک قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت قرار دیے جانے کا فیصلہ خاصا پرانا ہو چکا ہوگا۔ تاہم جی نہیں مانتا کہ ”میثاق“ کے صفحات اللہ تعالیٰ کے اُس احسانِ عظیم پر اُس کی جناب میں ہدیہ تشکر و امتنان پیش کرنے کی سعادت سے بالکل محروم رہ جائیں جو اس فیصلے کی صورت میں پوری ملتِ اسلامیہ پر ہوا ہے۔ اگرچہ عالمِ اسباب میں اس تاریخی فیصلے کے بہت سے عوامل ہیں، تاہم واقعہ یہ ہے کہ فی الحقیقت یہ سب کچھ ایک خالص خدائی تدبیر کے نتیجے میں ہوا، جس نے جملہ اسباب و عوامل کو طوعاً و کرہاً اُس طرح ایک ہی رخ میں پھیر دیا کہ اس فیصلے سے فرار کی کوئی راہ کسی کے لیے کھلی ہی نہ رہی اور بالکل معجزانہ طور پر وہ کٹھن مرحلہ طے ہو گیا جس کے طے ہونے کا کوئی امکان آج سے چھ ماہ قبل کسی بڑے سے بڑے سیاسی پنڈت کو بھی نظر نہ آسکتا تھا۔

اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ مبارک کے مطابق کہ ((مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَا يَشْكُرِ اللَّهَ)) ”جو لوگوں کا شکر یہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا“ پوری ملتِ اسلامی کی جانب سے مبارک باد اور شکرے کے مستحق ہیں وہ عوام بھی جنہوں نے دینی غیرت اور حمیت کا بھرپور ثبوت بھی دیا اور صبر و تحمل اور نظم و ضبط کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ پھر علماء کرام اور دینی و سیاسی جماعتوں کے رہنما اور کارکن بھی جنہوں نے نہایت منظم طریقے پر عوام کے جذبات کی ترجمانی کا فرض سرانجام دیا۔ اس سلسلے میں سخت محنت

اور مشقت بھی برداشت کی اور ہر طرح کے خطرات بھی مول لیے، یہاں تک کہ قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔ خصوصاً مولانا محمد یوسف بنوری جنہوں نے علالت و پیرانہ سالی اور ضعف و نقاہت کے باوجود ایسی شدید مشقت برداشت کی جس کا تحمل صحت مند نوجوانوں کے لیے بھی مشکل ہو۔ مبارک باد اور شکرے کے مستحق ہیں ارکانِ پارلیمنٹ بھی جنہوں نے عوام کے جذبات کا بھی پورا لحاظ کیا اور خود بھی دیانت دارانہ اور حقیقت پسندانہ روش اختیار کی۔ حکومت وقت بھی جس نے نہ اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنایا نہ نوشتہ دیوار کو پڑھنے سے انکار کیا، خصوصاً مسٹر بھٹو جو سیاسی تدبیر اور فہم و فراست کے اس کڑے امتحان سے کامیابی کے پھریرے اڑاتے ہوئے نکلے۔ لیکن ہمارے شکر و سپاس کا اصل حق دار اور ہمارے تشکر و امتنان کا سزاوار حقیقی ہے اللہ رب العالمین جو ”فَعَالٌ لِّمَا يُرِيدُ“ بھی ہے اور ”غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ“ بھی اور جس کے قبضہ قدرت میں ہیں تمام اسباب و علل اور جملہ وسائل و عوامل۔ فله الحمد فی السموات والارض وله الحمد فی الدنيا والآخرة۔

راقم الحروف ۲۴ مئی سے ۳۰ جون تک لاہور سے تقریباً مسلسل باہر رہا۔ پہلے کچھ بحالیِ صحت اور کچھ بعض معاملات و مسائل پر گوشہ تنہائی میں غور و فکر کے پیش نظر ایک سفر ایبٹ آباد اور وادی کاغان کا ہوا۔ پھر ایک طویل دورہ کراچی اور سندھ کے بعض دوسرے شہروں کا رہا۔ اسی دوران میں جب ”حادثہ ربوہ“ کی خبر پڑھی تو فوراً یہ خیال دل میں پیدا ہوا کہ غالباً تقدیر الہی میں فتنہ قادیانیت کی جس قدر مہلت طے تھی وہ پوری ہو چکی اور یہ رسی جتنی دراز ہونی مقدر تھی وہ ہو چکی۔ آج سے اس کے زوال کا آغاز ہو گیا۔ گویا ایک انگریزی محاورے کے مطابق: ”This is the beginning of their end!“ تبھی تو ان کی عقل ماری گئی اور ایسے ہوشیار، کیتا دشا طرگروہ کے ہاتھوں اتنی بڑی حماقت کا ارتکاب ہو گیا۔ چنانچہ اثنائے سفر میں نجی گفتگوؤں میں راقم اپنے اس تاثر کا اظہار کرتا رہا۔ جب ۲۸ جون کو سکھر کی نئی تعمیر شدہ لیکن قدیم بادشاہی طرز کی عظیم جامع مسجد میں اجتماع جمعہ سے خطاب کا موقع ملا تو وہاں بھی اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ یہ ایک خالص ماہنامہ میثاق (24) اکتوبر 2024ء

خدائی تدبیر ہے اور اس بار یہ مسئلہ ان شاء اللہ العزیز، ضرورتاً تسلی بخش طریقے پر طے ہو جائے گا۔ پھر تقریباً ڈیڑھ ماہ کی غیر حاضری کے بعد راقم نے ۵ جولائی کو جامع مسجد خضراء، سمن آباد میں جمعہ پڑھایا تو ایک مفصل تقریر میں پھر اسی توقع کا اظہار کیا۔ یہ تقریر ریکارڈ کر لی گئی تھی، اور محترم شیخ جمیل الرحمن صاحب نے اسے صفحہ قرطاس پر بھی منتقل کر لیا۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ اسے ’میثاق‘ میں شائع کر دیا جائے لیکن اُس وقت سنسر کی پابندی کے باعث ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ ذیل میں اس کا ابتدائی حصہ درج کیا جا رہا ہے تاکہ ایک تو ان کی خواہش پوری ہو جائے اور دوسرے یہ نہ کہا جاسکے کہ ہمارے یہ خیالات وقوع کے پیش آچکنے کے بعد کی خیالی آرائیوں کے قبیل سے ہیں۔

(تقریر کا بقیہ حصہ جو ’’عقیدہ ختم نبوت اور قرآن حکیم‘‘ کے موضوع پر اظہار خیال پر مشتمل ہے، ان شاء اللہ آئندہ اشاعت میں شائع کر دیا جائے گا!)

’’حمد وثنا اور تلاوت آیات کے بعد:

’’حضرات! ۲۴ مئی کے بعد آج ۵ جولائی کو ملاقات ہو رہی ہے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ ادھر تو جمعہ کے ان اجتماعات میں میرے خطابات کا سلسلہ عارضی طور پر لاہور سے باہر جانے کے سبب سے معطل ہوا اور ادھر ملک میں ایک نہایت ہیجان انگیز واقعہ پیش آ گیا، یعنی حادثہ ربوہ۔ اس کے بعد پوری شدت کے ساتھ اس مسئلے نے سراٹھایا جو اگرچہ موجود تو تقریباً ایک صدی سے ہے لیکن جس کا شدت کے ساتھ احساس ۱۹۵۳ء میں ہوا تھا۔ ۱۹۵۳ء کے حوادث کے بعد یہ مسئلہ دوبارہ بالکل دب گیا تھا۔ بجز اس کے کہ بعض افراد جیسے جناب شورش کشمیری اور ہمارے بزرگ حکیم عبدالرحیم اشرف اس کی فتنہ سامانی کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے یا بعض ادارے وقتاً فوقتاً کچھ کتابچے اور پمفلٹ اس کے بارے میں شائع کرتے رہتے تھے، کوئی عوامی تحریک موجود نہ تھی۔ اب ربوہ کے حادثے نے اس کو از سر نو زندہ کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلی مرتبہ اس کی حقیقی فتنہ انگیزی، سازشی فطرت اور مکاری کا ملک گیر احساس اجاگر ہوا اور ایوان حکومت سے خواص و عوام تک سب کی توجہ ادھر مبذول ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس مرتبہ جو یہ مسئلہ اٹھا

تو وہ کسی سیاسی پارٹی کی کوشش اور محنت سے نہیں اٹھا۔ حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ خالص ایک خدائی تدبیر ہے کہ اس طائفے کی عقل ماری گئی اور اس نے خود ہی اپنے ایک انتہائی غلط اقدام سے اس مسئلے کو زندہ کر دیا! یہ فتنہ اپنے سازشی کردار اور انتہائی مہارت کے ساتھ خاموشی سے جسد ملت میں سرطان کے پھوڑے کی طرح جڑیں جمانے کے اعتبار سے پوری ملت اسلامیہ کی تاریخ میں منفرد مقام رکھتا ہے۔ عام طور پر لوگوں کو اس کی ہلاکت خیزی کا اندازہ نہ تھا، بلکہ تعلیم یافتہ حضرات میں سے بھی اکثر اس سے بالکل ناواقف تھے، یا اس کے بارے میں گونا گوں غلط فہمیوں میں مبتلا تھے۔ اس مرتبہ جو یہ مسئلہ اٹھا ہے تو اگرچہ قادیانیوں نے تو اس کا کریڈٹ بھٹو صاحب کو دینے کی کوشش کی ہے تاہم اسے بھی ان کی سابقہ مکاریوں کا ایک تہہ یا ضمیمہ ہی سمجھنا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دفعہ اس مسئلہ کے اُبھرنے اور اُٹھنے میں نہ حکومت کا کوئی عمل دخل ہے نہ کسی اپوزیشن پارٹی کا ہاتھ، بلکہ علماء کی کسی تنظیم یا جماعت کا بھی اس میں کوئی دخل نہیں ہے! حقیقت یہ ہے کہ اس بار کوئی شخص اور سیاسی پارٹی یہ کریڈٹ لینے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اس مرتبہ یہ مسئلہ ایک خالص خدائی تدبیر کے تحت اٹھا ہے۔

میرے اس یقین کی بنیاد یہ حقیقت ہے کہ اس مرتبہ قادیانیوں کی طرف سے ربوہ سیشن پر جو اقدام ہوا وہ ان کے اپنے اساسی فلسفے، بنیادی طریق کار اور سابق طرز عمل سے بالکل مختلف ہے۔ ان کا رویہ اور طریقہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ حکومت وقت کو سلام کرو اور اس کی کاسہ لیسٹی، مدح سرائی اور ثنا خوانی کر کے اس سے مراعات حاصل کرو۔ پھر ان مراعات کے تحت غیر محسوس طور پر اندر ہی اندر اپنی جڑیں پھیلاؤ۔ اُمتِ مسلمہ کے ساتھ براہ راست تصادم سے ہمیشہ کٹی کترانا ان کا وپیرہ رہا ہے۔ یہی ان کا ابتدا سے فلسفہ ہے، یہی ان کا طریق کار ہے۔ انہوں نے نہ کبھی سیاسی میدان میں خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی کسی موقع پر جارحیت کا کوئی انداز اختیار کیا۔ اس لیے کہ سیاست کا مبتدی طالب علم بھی یہ بات جانتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی جمعیتیں اور جماعتیں یا فرقے اور گروہ کسی ملک میں بھی جارح ہو کر نہیں جی سکتے۔ مظلوم و مجروح ہو کر رہنے میں تو پھر بھی ان

کے زندہ رہنے کا امکان رہتا ہے۔ جارحیت کی صورت میں تو سوائے خاتمے کے اور کوئی صورت ہی نہیں۔ یہی فلسفہ تھا جس کے سہارے یہ آج تک پنپتے رہے ہیں۔ اسی فلسفے پر وہ انگریزی دور میں پوری طرح کاربند رہے۔ حکومت برطانیہ کی قصیدہ گوئی، اس کی خوشامد اس کو رحمتِ خداوندی قرار دے کر اس کو بقا و ترقی کی دعائیں دے کر اس کے مقاصد و مقادرات میں حمد و معاون ہو کر اس کے زیر سایہ اور زیر عاطفت رہ کر اور اس سے مراعات حاصل کر کے جسدِ ملت میں یہ سرطان کے مانند اپنی جڑیں پھیلاتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی یہ اسی طریق کار پر عمل پیرا رہے ہیں کہ خواہ کوئی بھی حکومت ہو اور کوئی بھی شخص یا جماعت برسرِ اقتدار ہو خود کو اس کا وفادار ثابت کریں اور خوشامد کے ذریعے مراعات پر مراعات حاصل کرتے چلے جائیں۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ نہ صرف ان کی طرف سے جارحیت کا ارتکاب ہوا بلکہ انہوں نے اس جارحیت کو وقت کی حکمران سیاسی پارٹی سے منسوب کرنے کی حماقت کر کے حکومتِ وقت کو اپنے مد مقابل لاکھڑا کیا۔ گویا ان کی حماقت کے نتیجے میں حکومت اور عوام دونوں ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔ یوں حکمران جماعت اور اپوزیشن کے مابین کسی قسم کی سیاسی غلط فہمی کے پیدا ہونے کا امکان ختم ہو گیا۔ لہذا ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ایک طرف تو یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اور دوسری طرف خود بخود حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ سیاسی پارٹیوں کی باہمی کشاکش کی نوبت آئے بغیر یہ امید پیدا ہو چلی ہے کہ اس مرتبہ ان شاء اللہ اس مسئلہ کا ایسا حل ضرور نکل آئے گا جو امت کے لیے قابل قبول ہو۔ اس سے پہلے کبھی ایسی صورت حال رونما نہیں ہوئی۔ بحمد اللہ اس حد تک تو معاملہ آ گیا ہے کہ ایک طرف اعلیٰ سطحی تحقیقاتی عدالت کا تقرر ہوا ہے جس کے Terms of Reference کافی وسیع کر دیے گئے ہیں۔ تمام معاملات اس عدالت کے سامنے لائے جا رہے ہیں۔ یوں اس گروہ کا گھٹاؤ ناکردار تحقیقاتی عدالت کے سامنے آ جائے گا اور یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ اس گروہ کا مقام دائرہ ملت کے اندر نہیں بلکہ باہر ہے۔ دوسری طرف اس ملک کے سب سے بااختیار ادارے یعنی پارلیمنٹ میں بھی اس مسئلے پر باقاعدہ غور و فکر

شروع ہو گیا ہے۔ یہ دونوں صورتیں اس مسئلہ کے صحیح حل کے لیے نہایت مناسب ہیں۔ اس بات سے بالکل قطع نظر کر لیجئے کہ اس مسئلہ کے حل سے کس کا کیا مفاد وابستہ ہے۔ حکمران پارٹی کیا چاہتی ہے اور اپوزیشن پارٹیاں کیا چاہتی ہیں! ان سب سے صرف نظر کرتے ہوئے میں عرض کرتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے شکر کا مقام ہے کہ اس مسئلہ کے حل کے لیے قانونی اور دستوری طور پر ممکنہ صحیح اقدامات کر لیے گئے ہیں اور یہ امید پیدا ہو چلی ہے کہ اس مرتبہ یہ مسئلہ ان شاء اللہ ضرور حل ہو جائے گا۔

البتہ اس موقع پر تین احتیاطوں کی ضرورت ہے:

\* ایک احتیاط تو عوام کو کرنی چاہیے کہ معاملہ کسی صورت میں بھی ہنگامہ انجکشن اور دنگے فساد کی شکل اختیار نہ کرنے پائے اس لیے کہ یہ قادیانیوں کے جال میں پھسنے کے مترادف ہوگا۔ بعض معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۵۳ء میں بھی قادیانیوں نے پاکستان سے نقل مکانی کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی یہ کوشش بھی تھی کہ کسی طرح ہنگامہ کی صورت پیدا ہو اور حکومت اور عوام کے مابین شدید نوعیت کا تصادم پیدا ہو جائے۔ جب وہ اس میں کامیاب ہو گئے اور مارشل لاء لگ گیا تو وہ جو چاہتے تھے وہ ہو گیا، یوں ان کے قدم جم گئے۔ اب بھی ان کی طرف سے اشتعال انگیزی کی جارہی ہے۔ جہاں بھی فساد اور لوٹ مار کا معاملہ ہوا یا فائرنگ تک نوبت پہنچی وہاں ابتدا ان ہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ ایک ہنگامہ خیز اور دھماکا خیز صورت بنا کر حالات کا رخ اس طرف پھیر دیا جائے کہ ملک میں امن و امان کا گمبھیر مسئلہ اٹھ کھڑا ہو، تاکہ حکومت اور عوام میں خوف ناک تصادم ہو جائے۔ نتیجہ موجودہ دستوری اور آئینی نظام درہم برہم ہو جائے اور اختیارات فوج کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائیں۔ فوج کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو کسی سیاسی یا دینی مسئلہ کی تائید یا مخالفت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ خالص انتظامی معاملہ سمجھ کر امن و امان قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی بدامنی اور ہنگامے کو فرو کر دینا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ لہذا قادیانیوں کو اسی میں اپنی عافیت نظر آتی ہے کہ ملک میں بڑے پیمانہ پر

لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ کھڑا کر دیا جائے۔ ربوہ میں کسی جگہ نمایاں طور پر یہ عبارت لکھی گئی تھی کہ ”خدا اپنی فوجوں کے ساتھ آ رہا ہے۔“ گویا انہوں نے اپنی طرف سے اس بات کا پورا اہتمام کر لیا تھا کہ کسی طرح ملک میں سول ایڈمنسٹریشن فیمل ہو جائے اور فوج انتظامیہ کے اختیارات اپنے ہاتھ میں سنبھال لے تاکہ ایک طرف دستور معطل ہو جائے اور دوسری طرف وہ اپنے سازشی طور پر یقوں سے فوج کو متاثر کر کے فائدہ اٹھا سکیں۔ لہذا اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ عوام ہر قسم کی اشتعال انگیزی پر ضبط و تحمل اور صبر سے کام لیں اور کسی وقت بھی کوئی ایسی صورت حال پیدا نہ ہونے دیں جس سے لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ اگر اس قسم کا کوئی بھی معاملہ ہو گیا تو درحقیقت یہ قادیانیوں کی تدبیر کی کامیابی ہوگی اور گویا ہم خود ان کے جال میں پھنس جائیں گے۔

\* دوسری احتیاط تمام سیاسی اور دینی پارٹیوں کو یہ کرنی چاہیے کہ اس مسئلہ کے اٹھانے اور اس کے حل کا کریڈٹ لینے کی کوشش سے بھرپور اجتناب کیا جائے۔ اس مسئلے سے سیاسی مفاد حاصل کرنے کی ادنیٰ سی کوشش بھی پورے معاملہ کو خراب کر سکتی ہے لہذا اس سے دامن بچانا از حد ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر کسی پارٹی کی جانب سے اس رجحان کا اظہار کہ یہ معاملہ اس کی کوششوں سے اٹھا ہے اور اس کی کامیابی کا سہرا اس کے سر بندھنا چاہیے انتہائی تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔

\* تیسری احتیاط یہ ہونی چاہیے کہ کسی موقع پر بھی اس معاملہ کو حکومت اور حزب اختلاف کے مابین طاقت آزمائی کا رنگ نہ دیا جائے۔ ماضی میں ایسا ہو چکا ہے کہ اس مسئلے سے بعض گروہوں اور سیاسی پارٹیوں نے سیاسی مفادات حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس کو حکومت versus حزب اختلاف کا مسئلہ بنا دیا جس کے نتیجے میں مسئلہ حل ہونے کے بجائے لائیو بن گیا۔ اس سلسلے میں یہ بات نہایت اُمید افزا اور اطمینان بخش ہے اور گویا ایک نہایت نیک شگون کاردرجہ رکھتی ہے کہ اس بار متحدہ مجلس عمل کی قیادت مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہ کو سونپی گئی ہے جو ایک خالص غیر سیاسی شخصیت ہیں۔ چاہے ملک کے ہر شہری کی طرح ان کے بھی کچھ مخصوص سیاسی نظریات ہوں، بہر حال وہ عملی سیاست کے میدان سے

بالکل علیحدہ رہتے ہوئے صرف علمی اور تدریسی مشاغل میں ہمتن مصروف ہیں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ مولانا کی قیادت میں یہ تحریک سیاست کی نذر ہونے سے بچ جائے گی اور معاملہ حکومت بمقابلہ احزاب اختلاف کا نہیں بنے گا بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر مسئلے کے حل کا کریڈٹ حکمران پارٹی لینا چاہتی ہو تو وہ بے شک لے لے۔ ہمیں ساری دلچسپی اس سے ہونی چاہیے کہ اس مرتبہ کسی طرح یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے مطالبے کے مطابق حل ہو جائے۔ میں اسی بات کو سکھر کے ایک اجتماع میں بھی بیان کر چکا ہوں، مختلف ذرائع سے اپنی یہ گزارشات علماء کرام اور سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں تک بھی پہنچا چکا ہوں اور آج پھر اس کا اظہار کر رہا ہوں کہ اس مرتبہ یہ مسئلہ قادیانیوں کی حماقت سے اور پورے زور شور سے اٹھا ہے۔ اس میں کسی سیاسی پارٹی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ خالص خدائی تدبیر ہے۔ اللہ نے ہمیں موقع عطا فرمایا ہے کہ اس صورت حال سے صحیح فائدہ اٹھالیں۔ اگر ہم نے کفرانِ نعمت کیا تو نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مسئلہ کتنے طویل عرصے کے لیے دوبارہ سرد خانے میں چلا جائے۔ اس مسئلہ کو نئے سرے سے اٹھانا آسان نہیں ہوگا۔ ۱۹۵۳ء کے بعد سے یہ مسئلہ جس طرح دب گیا تھا وہ آپ کو معلوم ہے۔ لہذا اس موقع پر ہمیں پورے دینی اور سیاسی فہم کا ثبوت دینا چاہیے اور ہر قسم کی اشتعال انگیزی پر ضبط و تحمل کا ثبوت دیتے ہوئے پُر امن ذرائع سے اپنا مطالبہ جاری رکھنا چاہیے۔ دلائل سے اپنی بات منوانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہنگامہ آرائی سے دامن بچانا چاہیے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ حکومت کی سطح پر اس فتنہ پر تشویش کا اظہار ہوا ہے اور بڑی اعلیٰ سطح پر یہ احساس اُجاگر ہوا ہے کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے اور اس کا صحیح حل تلاش کرنے کی واقعاً ضرورت ہے۔ یہ صورت حال بڑی اطمینان بخش ہے۔ لہذا ہمیں موقع دینا چاہیے کہ ایوانِ نمائندگان پُر امن فضا میں اس مسئلہ کو اس صحیح حل تک پہنچا سکے جو پوری اُمتِ مُسلمہ کے لیے قابل قبول ہو۔

جہاں تک اس مطالبہ کا تعلق ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی کے بقول اس سے زیادہ نرم

کوئی اور مطالبہ نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ کسی کمیونٹی کو باقاعدہ اقلیت (minority) تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے بہت سے قانونی حقوق اور تحفظات دے دیے جائیں! یہ گویا ایک اعتبار سے اس کی قانونی حیثیت کا تعین اور بین الاقوامی سطح پر اس کے حقوق کا اعتراف ہے۔ اگر کوئی ملک کسی کمیونٹی کو اپنے ہاں اقلیت کی حیثیت سے تسلیم کر لے تو گویا اقوام متحدہ کے تمام ادارے اس کے پشت پناہ ہو گئے۔ یو این او اس کی کسٹوڈین بن گئی۔ بین الاقوامی عدالت اس کے معاملات میں مداخلت کی مجاز ہو گئی۔ بحیثیت اقلیت ان کے حقوق آپ کو باقاعدہ ملنے کے ہوں گے اور ان کو اپنی کتاب دستور میں مندرج کرنا ہوگا۔ ان حقوق کی ادائیگی کی آپ کو ضمانت دینی ہوگی اور آپ کے ملک کی عدالتیں ان حقوق کی نگہداشت کریں گی۔ قادیانیوں کے لیے اس سے زیادہ فیاضانہ سلوک کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔ ختم نبوت اُمتِ مسلمہ کا ایک ایسا اجماعی عقیدہ ہے کہ اس میں کسی اعتبار سے رخنہ ڈالنا یا درڑ پیدا کرنا ہمیشہ سے ارتداد کی ایک پختہ اور متفق علیہ بنیاد رہی ہے۔ دوسری طرف قتل مرتد اور خصوصاً منظم مرتدین کے ساتھ قتال کے مسئلے پر بھی ہمیشہ سے اُمت کا اجماع ہے۔ یہ تو اس دور کی ”برکات“ ہیں، بقول اکبر الہ آبادی:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ  
گلے میں جو آئیں وہ تائیں اڑاؤ  
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسر  
”انا الحق“ کہو اور پھانسی نہ پاؤ!

کہ جس نے جو چاہا کہہ دیا اور جو جی میں آیا دعویٰ کر دیا اور اسے کوئی فکر نہیں کہ میرا حشر کیا ہوگا اور میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا! مرزا صاحب کے تمام دعاوی برٹش راج میں ہوئے۔ یہ دعوے برطانوی سامراج کے اپنے مفاد میں تھے۔ پھر مسلمانوں میں انتشارِ فکر و نظر اس کو عین مطلوب تھا لہذا وہ کیوں ان کا ٹوٹس لیتا! اس نے تو ان کی سرپرستی کی اور خوب سرپرستی کی۔ اس کی سرپرستی اور نگہداشت میں یہ پودا نہیں، جھاڑ جھکار نشوونما پاتا رہا۔ اگر کہیں خلافتِ راشدہ کا دور ہوتا یا کوئی بھی اسلامی حکومت ہوتی تو آٹے دال کا بھوؤ معلوم ہو جاتا۔ ایسا دعویٰ کرنے

والے کا مقام دارورسن ہوتا یا پھر اس دعویٰ کو ماننے والوں کے ساتھ باقاعدہ قتال ہوتا۔ ان کی جان اور ان کا مال مسلمانوں کے لیے مباح قرار پاتا اور ان کے ساتھ معاملہ وہی کیا جاتا جو متحارب کفار اور مشرکین کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ کا سینہ بڑا کشادہ رہا ہے۔ ہمارے ہاں تکفیر کا مسئلہ بہت ہی نازک مسئلہ سمجھا گیا ہے۔ عام طور پر جو یہ بات مشہور ہے کہ تکفیر ایک آسان سا معاملہ ہے تو یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ ہمارے ہاں تکفیر کا معاملہ بہت کم ہوا ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں کفر کا فتویٰ مختلف عقائد اور اعمال پر لگتا رہا ہے۔ متعین افراد یا گروہوں کی باقاعدہ تکفیر شاذ ہی کبھی ہوئی ہے۔ گنتی کی مثالیں ہی ملیں گی کہ کسی اسلامی حکومت نے متعین طور پر کسی خاص شخص یا جماعت کی تکفیر کر کے اس کو جسد ملت سے کاٹ پھینکا ہو۔ ارتداد یا تکفیر کا معاملہ انہی افراد کے ساتھ کیا گیا ہے کہ جن کے قول اور عقیدہ کی کوئی تاویل اور توجیہ ممکن ہی نہ رہی ہو اور صریح ارتداد یا کفر کا ایسا ثبوت فراہم ہو گیا ہو جس کی تردید ممکن نہ ہو۔ پھر ایسے افراد کے ساتھ بھی انتہائی سزا یعنی قتل سے قبل پوری طرح افہام و تفہیم کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس کے مقابلے میں عیسائیت کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ معمولی، چھوٹی اور بالکل فروغی باتوں پر کیسی کیسی بہیمانہ اور وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں اور کس طرح بے دریغ ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ ہمارا اجتماعی مزاج اس کے بالکل برعکس رہا ہے۔ البتہ قادیانیوں کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے وہ رخنہ پیدا کیا ہے کہ اگر اس سے صرف نظر کیا گیا تو ملت کی شیرازہ بندی ممکن ہی نہیں رہے گی۔

دعوائے نبوت درحقیقت ایسا فتنہ ہے کہ جس سے وہ بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے جس پر اسلام کا قصر کھڑا ہے۔ نبوت سے کم تر درجہ کے بہت سے فتنے ہمارے ہاں اٹھتے رہے اور اُمت نے انہیں برداشت کیا ہے لیکن نبوت کے دروازے کو اگر ایک ہی بار کھول دیا گیا تو اُمت میں تفریق کا ایک مسلسل عمل شروع ہو جائے گا جس کی پھر کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی دعوائے نبوت کرے گا تو لازماً اس کے دو نتائج مترتب ہوں گے۔ اس کو ماننے والا مؤمن اور اس کا انکار کرنے والا کافر قرار پائے گا۔ نبی ایک میزان اور فرقان بن کر آتا ہے۔ وہ کفر و



ایمان کا معیار بن کر آتا ہے۔ جو اس کو نہ مانے چاہے وہ دیگر تمام باتوں کو مانتا ہو یہاں تک کہ وہ خدا کو خالص تو حید کے ساتھ مانتا ہو آخرت کو مانتا ہو اور ان تمام تفصیل کے ساتھ مانتا ہو جن کی خبر انبیاء و رسل دیتے چلے آئے ہیں حضرت آدم سے لے کر اس نبی سے پہلے آنے والے تمام نبیوں اور رسولوں کو مانتا ہو تمام صحیفوں اور کتابوں کو مانتا ہو ملائکہ کو مانتا ہو بڑا ہی مفتی ہو لیکن مجرد اس بات سے کہ اس نے ایک نبی کا انکار کر دیا اس پر کفر کا ٹھپہ لگ جائے گا اور وہ مؤمن نہیں بلکہ کافر قرار پائے گا۔ گویا نبوت کا لازمی اور منطقی نتیجہ تفریق ہے۔ غور کیجیے کہ یہود اور نصاریٰ کے مابین آخر کیا چیز ماہ الاختلاف ہے؟ عیسائی اب بھی جس کتاب کو لیے پھرتے ہیں اس میں انجیل (New Testament) کے ساتھ عہد نامہ عتیق (Old Testament) کے نام سے بنی اسرائیل کے انبیاء پر نازل ہونے والے تمام صحیفے شامل ہیں۔ گویا عیسائی تورات، زبور اور تمام صحیفوں کو بھی مانتے ہیں اور حضرت آدم سے حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہا الصلوٰۃ والسلام تک تمام نبیوں اور رسولوں کو بھی مانتے ہیں لیکن پھر بھی یہ دو علیحدہ علیحدہ امتیں ہیں۔ یہ فرق کیوں واقع ہوا؟ صرف اس لیے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا اور عیسائیوں نے ان کو مانتا تو بنی اسرائیل میں تفریق ہو گئی۔ اب یہ دو بالکل جدا امتیں ہو گئیں۔ یہود کے نزدیک حضرت عیسیٰ کو نبی اور رسول ماننے والے دائرہ ایمان سے خارج ہو کر کافر ہو گئے اور عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ کے انکار کی وجہ سے یہود کافر قرار پائے۔ مزید غور کیجیے کہ ہمارے اور عیسائیوں کے مابین فرق کیا ہے! یہاں میری مراد ان لوگوں سے ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا نبی اور رسول مانتے ہوں اور جو حقیقتاً حضرت مسیح کے تابع ہوں۔ ہم حضرت عیسیٰ کو مانتے ہیں لیکن یہ تبیین حضرت مسیح کے ہمارے نبی سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے۔ لہذا ہمارے نزدیک وہ کافر اور ان کے نزدیک ہم کافر۔ گویا یہ وہ منطقی نتیجہ ہے جس تک خود قادیانیوں نے اس مسئلے کو پہنچایا ہے۔ جب وہ ایک نئی نبوت پر ایمان کے مدعی ہیں تو ان کے نزدیک اس نبوت کا انکار کرنے والے کافر اور ہمارے نزدیک اس نبوت کو ماننے والے کافر۔

اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ نبی نبوت کا کھڑا کر مول لیا گیا! اور اصل نبوت کی بنیاد پر جو تنظیم قائم ہوتی ہے اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا آپ تصور ہی نہیں کر سکتے۔ جس کسی نے کسی کو نبی مان لیا اس نے گویا ہر اعتبار سے اپنے آپ کو اس نبی کی کامل فرماں برداری میں دے دیا اور خود کو بالکل سرنڈر کر دیا۔ اب اس نبی کے مقابلے میں اس کا فکر اس کی عقل اور اس کی رائے سب معطل ہو جائیں گے۔ کوئی شخص جب ظلی طور پر بروزی طور پر یا کسی اور اعتبار سے خود کو ایک مرتبہ نبی منوالے تو اب وہ ماننے والے کے لیے امام معصوم بھی ہو گیا واجب الطاعت بھی ہو گیا۔ اس کی رائے سے اختلاف اور اس کے حکم سے انحراف کفر ہو جائے گا حتیٰ کہ اس کے خلاف دل میں کدورت کے جذبات رکھنا بھی کفر کے زمرے میں آئے گا۔ پس ایسے شخص کے گرد جو تنظیم بنے گی اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی تنظیم کے علاوہ جو دوسری تنظیمیں ہوں گی ان کے صدر سے امیر سے سربراہ سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں ان کے خلاف سوء ظن میں بھی مبتلا ہو سکتے ہیں ان کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے پیش بھی کر سکتے ہیں اور اس پر عمل بھی کر سکتے ہیں کیونکہ یہاں معاملہ ایمان و کفر کا نہیں ہوتا، لیکن اس کے برعکس جہاں کسی کو نبی مان لیا گیا ہو وہاں ان تمام امکانات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ اس برصغیر میں قادیانیوں کی تنظیم سے بہتر اور مضبوط کوئی تنظیم نہیں ہے اور اس کا سبب یہی ”نبوت“ کا تصور ہے۔ یہ فائدہ نبوت کے دعویٰ کے بغیر حاصل ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔

پھر انہوں نے نبوت کے لازمی اور منطقی نتیجہ کو خود ہی لوگوں کے سامنے واضح کر کے پیش کر دیا۔ عامۃ المسلمین سے ان کی مساجد علیحدہ نمازیں علیحدہ یہاں تک کہ وہ ہمارے جنازے میں شرکت نہیں کریں گے<sup>(۱)</sup>۔ حد یہ ہے کہ وہ ہمارے بچوں کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہوں گے۔ یہ بات باقاعدہ سوال و جواب کی صورت میں ان کے لٹریچر میں موجود ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود سے

(۱) مشہور ہے کہ چودھری سرفظر اللہ خاں نے جو وزیر اعظم لیاقت علی خاں کی کابینہ میں وزیر امور خارجہ تھے اپنے محسن، مربی اور بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کی نماز جنازہ میں شرکت نہیں کی تھی۔

پوچھا گیا: بچے تو معصوم ہوتے ہیں، اگر غیر احمدی بچوں کے جنازہ کی نماز میں شرکت کر لی جائے تو کیا ہرج ہے؟ جواب دیا گیا: کیا آپ عیسائیوں کے بچوں کے نماز جنازہ میں شرکت کر سکتے ہیں؟ اسی طرح انہوں نے کسی غیر احمدی لڑکے سے احمدی لڑکی کا نکاح ناجائز اور غیر احمدی کی لڑکی سے احمدی کا نکاح جائز قرار دیا۔ دلیل یہ دی گئی کہ اہل کتاب کی لڑکیوں سے نکاح جائز لیکن ان کو لڑکی دینا ناجائز ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس معاملہ کو منطقی انتہا تک تو قادیانی خود پہنچائیں، اس کے جملہ مضمرات کو کھول کر وہ خود واضح کریں اور پھر اس کا جو عملی نتیجہ نکلتا چاہیے، یعنی یہ کہ ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو یہ اس پر واہلا کریں۔ اس میں آخر کیا مقولیت ہے؟ خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اعتقادی طور پر وہ اپنے آپ کو خود ہی ایک علیحدہ اُمت قرار دے چکے ہیں لیکن اس کے مقدرات کو اس لیے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اس طرح ان کے توسیع پسندانہ عزائم میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اُمتِ مسلمہ میں شامل رہ کر وہ جس طرح ہر قسم کے مادی فوائد سے متمتع ہو رہے ہیں، اس میں خلل واقع ہوتا ہے۔ غیر مسلم اقلیت ہونے کے باعث وہ حکومت کے تمام کلیدی مناصب سے محروم کر دیے جائیں گے۔ حکومت کے دفاتر اور محکمہ جات کی ملازمتوں میں عددی تناسب کے لحاظ سے ان کا کوٹا مقرر ہو جائے گا۔ تبلیغ اسلام کے نام سے جو زرمبادلہ کثیر مقدار میں وہ ہر سال حاصل کرتے ہیں، اس پر قدغن لگ جائے گی۔ مسلمانوں میں شامل رہنے کے سبب سے فوج، سفارت خانوں اور دیگر محکموں کے اعلیٰ عہدوں تک ان کو جو پہنچ اور دسترس حاصل ہے اس پر پابندی عائد ہو جائے گی۔ یہ نقصانات وہ ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آکاس ہیل کی طرح شہرِ ملت سے لپٹے رہیں تاکہ اسی سے غذا حاصل کرتے رہیں اور اسی کی بربادی کا باعث ہوں۔ اسی لیے وہ واویلا مچا رہے ہیں اور خود کو ”مسلمان“ ثابت کرنے کے لیے اپنے روایتی دجل و فریب سے کام لے رہے ہیں۔ درحقیقت انہوں نے خود اپنے اختیار کردہ موقف کے اعتبار سے اپنے علاوہ بقیہ تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے کر بحیثیت ایک جداگانہ اُمت اپنا تشخص تین چوتھائی صدی قبل ہی طے کر لیا تھا۔ ان

حالات کی بنا پر ہر معقول اور انصاف پسند شخص اس نتیجہ پر بہ ادنیٰ تامل پہنچ جاتا ہے کہ قادیانیوں کو ایک جداگانہ غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے۔ یہ انتہائی نرم معقول اور ہلکا نیز ان کے حق میں مفید فیصلہ ہے۔ اگر یہاں فی الواقع دینی نظام نافذ ہوتا تو ان کو نئی نبوت کے اجراء اور اس کو ماننے کے جو نتائج بھگتتے پڑتے وہ ان کے لیے کہیں زیادہ سخت ہوتے۔ یہ تو لادینیت کا دور ہے اور ملک میں ابھی تک بالفعل انگریزی دور کا نظام معمولی حک و اضافہ کے ساتھ نافذ ہے، اسی لیے ان کے ساتھ انتہائی نرم سلوک کا مطالبہ ہے، ورنہ ان کے ساتھ معاملہ وہ ہوتا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوا۔ ان کو ارتداد کی ایسی سزاؤں سے واسطہ پڑتا جو خلافتِ راشدہ کے بعد بھی اسلامی سلطنت میں دی جاتی رہیں۔ یہ تو اکبر الہ آبادی کے بقول اس دور کی برکت ہے کہ ”انا لحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ!“ کتنے ہی لغو اور مضحکہ خیز دعویٰ کیے گئے، حتیٰ کہ نبوت کے قلعے میں بھی رخنہ ڈال دیا گیا اور نئی نبوت کے ٹھاٹھ بالفعل جمادیے گئے۔ اپنے علاوہ عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے دیا، ان کے بچوں کی بھی تکفیر کر ڈالی لیکن نہ صرف یہ کہ ان کا کچھ نہ بگڑے بلکہ وہ مسلمانوں میں شامل رہ کر تمام حقوق سے استفادہ بھی کرتے رہے۔ اپنے خالص سازشی کردار اور ”انجمن امدادِ باہمی“ کے طرز پر کام کرتے ہوئے اپنے جائز حقوق سے کہیں بڑھ کر سہولتیں اور مراعات حاصل کیں۔ بہر حال یہ نرم ترین اور انتہائی وسعت قلبی کا سلوک ہے جو اُمتِ مسلمہ ان کے ساتھ روا رکھنا چاہتی ہے، یعنی یہ کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر ان کے حقوق و فرائض متعین کر دیے جائیں اور ان کو ہمیشہ کے لیے جسدِ ملت اسلامی سے علیحدہ کر دیا جائے۔“

ہمارے نزدیک قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے لیے فیصلہ ان ”معجزات“ کے سلسلے کی تازہ ترین اور اہم ترین کڑی ہے جن کی بنا پر ہمیں یہ یقین حاصل ہے کہ پاکستان کا قیام اسلام کے احیاء اور دین حق کے اس عالمی غلبے کی خدائی سکیم کا ایک اہم جزو ہے جس کی خبر خیر صادق رضی اللہ عنہ نے دی تھی۔



## ترتیبِ اولاد: باپ کا کردار

راحیل گوہر صدیقی \*

اس کائنات میں کوئی بھی انسان تمام فرائض اور افعال تن تنہا ادا نہیں کر سکتا، بلکہ ان کی تکمیل کے لیے معاشرے کی ضرورت پڑتی ہے۔ معاشرہ انسان کی طبعی ضرورت ہے اس لیے ایک ذی عقل انسان معاشرے سے منقطع ہو کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ جو لوگ غاروں، سنسان میدانوں یا جنگلوں میں زندگی بسر کرتے ہیں انہیں کوئی انسانی فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس حالت میں انسان کی تمام اخلاقی قوتیں مُردہ ہو جاتی ہیں۔ ان سے بھلائی یا برائی کچھ بھی سرزد نہیں ہوتی۔ انسان کی تخلیق کی غرض و غایت میں سے ایک نسلِ انسانی کو جاری رکھنا بھی ہے۔

فرمان الہی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً﴾ (النساء: ۱)

”لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک جان (آدم) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا، پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد و عورت (پیدا کر کے روئے زمین پر) پھیلا دیے۔“

انسان میں دو قوتیں ہیں۔ قوتِ عاقلہ کے ذریعے سے انسان علم و حکمت حاصل کرتا ہے جبکہ قوتِ فاعلہ کو کام میں لا کر اپنے تمام معاملات میں تنظیم پیدا کرتا ہے۔ انسان کی سعادت ان دونوں قوتوں کی تکمیل کا نام ہے۔ پہلی کے ذریعے سے انسان صحیح فکر اور صحیح عقائد حاصل کرتا ہے اور اس پر تمام اسرار الہی منکشف ہو جاتے ہیں۔ دوسری قوت اسے اخلاقی کمال کے حصول میں مدد فراہم کرتی ہے۔ تمام قومی و ملکات اور افعال کی ترتیب سے اخلاقی کمال حاصل ہوتا ہے۔ یہ

☆ معاون مسئول شعبہ تصنیف و تالیف، قرآن اکیڈمی، بلین آباد کراچی

ترتیب اس طرح سے دی جاتی ہے کہ ایک قوت دوسری قوت پر غالب آجائے۔

فطری طبائع کے لحاظ سے لوگوں میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ قلیل تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو فطری طور پر نیک ہوتے ہیں، کبھی بد نہیں ہو سکتے، کیونکہ فطری چیز میں تغیر واقع نہیں ہوتا۔ دوسری طرف بہت سے لوگ ایسے ہیں جو طبعاً بد ہیں اور کبھی نیک نہیں ہو سکتے۔ انسانوں کی ایک تیسری قسم ایسی ہے جو فطری طور پر نہ نیک ہوتے ہیں اور نہ بد، بلکہ تعلیم و تربیت اور صحبت کے اثرات سے نیکی یا بدی اختیار کر لیتے ہیں۔ انسان اگر فطری طور پر نیک اور صالح ہو تو اس کا وجود ایک سایہ دار گھنے درخت کی طرح ہوتا ہے جو مسافروں کو تپتی دھوپ میں اپنے ٹھنڈے اور فرحت بخش سائے کے ذریعے بدنی و قلبی راحت عطا کرتا ہے۔ ایسا ہی شخص ایک مشفق باپ، وفا شعار خاوند اور حساس دل رکھنے والا بھائی اور بیٹا ثابت ہوتا ہے۔ اس کی نیکیاں برگ و بار لاتی ہیں اور اس کا وجود کئی نسلوں کو اعلیٰ اخلاق و کردار کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔

یہ دنیا حقوق و فرائض کے بندھن میں بندھی ہوئی ہے، جہاں کسی کے کچھ حقوق ہیں تو وہاں اس پر کچھ فرائض بھی عائد کیے گئے ہیں۔ یہ اسلام کے اخلاقی تقاضوں میں ایک اہم تقاضا ہے۔ اگر انسان کچھ فرائض ادا کرتا ہے تو وہ دوسروں سے امیدیں بھی وابستہ کر لیتا ہے۔ حقوق و فرائض کے کچھ پہلو تو ایسے ہیں کہ اگر ان میں توازن قائم نہ رکھا جائے تو معاشرہ کا حسن گہنا جاتا ہے۔ اسلام بدلے کے طرز عمل کو پسند نہیں کرتا۔ ”کچھ لو، کچھ دو“ (Give and take) دنیا کا اپنا وضع کردہ اصول ہے، جبکہ ایثار و قربانی کا اپنا ایک حسن ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے ساتھ برا اور ناروا سلوک کرے تو اس کے جواب میں تم اس سے بہتر سلوک کرو۔ یہی ایک صالح انسان کی شناخت ہے۔ فرمان الہی ہے:

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ﴾ (خم السجدہ)

”اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی، تو (سخت کلامی کا) ایسے طریق سے جواب دو جو بہت اچھا ہو (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے) کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی وہ گویا تمہارا گرم جوش دوست ہے۔“

اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں والدین اور اولاد کے مابین حقوق و فرائض کا رشتہ بہت

حساس نوعیت کا ہے۔ یہ جذبات و احساس کے وہ آئینے ہیں جو راسی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی بھی غفلت اور کمی کوتاہی سے اللہ کی سخت ناراضگی کا احتمال ہوتا ہے۔ والدین کے حقوق پر تو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں بہت زور دیا ہے۔ قرآن حکیم میں پانچ مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حق (شرک سے اجتناب) کے فوراً بعد والدین کے حقوق کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِضْلُهُ فِي عَاصِمِينَ  
إِنِ الشُّكْرُ لِلَّهِ وَلِلَّهِ الْيَدِ الْبَارِيَّةُ إِلَىٰ الْمَصِينِينَ ﴿١٣﴾﴾ (لقمن)

”ہم نے انسان کو اپنے والدین سے (حسن سلوک کا) تاکید کر دیا ہے۔ اس کی ماں نے کمزوری سہتے ہوئے اسے اٹھائے رکھا اور دو سال اس کے دودھ چھڑانے میں لگے۔ چنانچہ میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا بھی میرے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے۔“

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۗ إِمَّا يَبُلُغَنَّ عِنْدَكَ  
الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَيْهِمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا آفٌ وَلَا تُنْهَرُهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا  
كَرِيمًا ﴿٣١﴾ وَاحْفَظْ لَهُمَا جَنَاحَ الذَّلِيلِ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا  
رَبَّيْتَنِي صَغِيرًا ﴿٣٢﴾﴾ (الاسراء)

”آپ کے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اُس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اُف تک نہ کہو نہ ہی انہیں جھڑکو، اور ان سے ادب سے بات کرو۔ اور انکساری اور نیاز مندی سے ان کے آگے جھکے رہو اور دعا کرتے رہو: اے میرے رب! ان پر رحم فرما جیسے انہوں نے بچپن میں مجھے پالا تھا۔“

اللہ تعالیٰ نے والدین کو بھی اولاد کے حقوق اور ان کی تربیت کرنے کا پابند کیا ہے۔ انسانی معاملات اور ان کے باہمی تعلقات کے اسی حسن توازن نے اسلام کو دینِ فطرت بنا دیا ہے۔

والدین پر اولاد کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ ان کی زندگی شروع ہونے سے پہلے ہی اس کو ختم کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ یہ نہ سوچا جائے کہ ان کا بوجھ ہم کیسے اٹھائیں گے اور انہیں پروان چڑھانے کے لیے مالی وسائل کہاں سے آئیں گے۔ ایک اور خباثِ ابلیسِ دل میں ڈالتا

ہے کہ اولاد کا وجود ہماری آسائشیں اور پُرکشش زندگی کے لیے وبالِ جان بن جائے گا۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ خبردار کرتا ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَىٰ اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقْرَّهَا وَمُسْتَوْدَعُهَا ۗ  
كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴿٦٠﴾﴾ (ہود)

”زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور وہ اس کی قرار گاہ کو بھی جانتا ہے اور اس کے دُن ہونے کی جگہ کو بھی۔ یہ سب کچھ کتابِ واضح (لوحِ محفوظ) میں لکھا ہوا ہے۔“

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((افْتَحُوا عَلَيَّ صَبِيئَانِكُمْ أَوَّلَ كَلِمَةٍ بِلَا إِلَهٍ إِلَّا اللَّهُ .....))

(السلسلة الضعيفة: ٦١٣٦)

”اپنے بچوں کو زبان کھولنے کے بعد سب سے پہلے کہہ لا اِلَهَ اِلَّا اللهُ سَكَلَاوُ .....“

ایک اور مقام پر حسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدًا مِنْ نَحْلٍ اَفْضَلَ مِنْ اَدَبٍ حَسَنٍ))

(سنن الترمذی: ١٩٥٢)

”کسی باپ نے اپنی اولاد کو کوئی عطیہ اور تحفہ حسنِ ادب سے بہتر نہیں دیا۔“

یعنی ایک باپ کا اپنی اولاد کے لیے سب سے اعلیٰ اور بیش بہا تحفہ یہ ہے کہ وہ اس کی تربیت اسلام کے بتائے ہوئے خطوط پر کرے۔ اسلام امن و سلامتی کا دین ہے۔ یہ عالمِ انسانیت کے لیے محبت، اخوت، رحمت، ایثار، قربانی اور عدلِ اجتماعی کا پیامبر بن کر آیا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشادِ ربّانی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقْوُدُهَا النَّاسُ وَالْجِبَارُ  
عَلَيْهَا مَلَكَةٌ غُلَاظٌ شِدَادٌ﴾ (التحریم: ٦)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جس

کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، جس پر تندخوا اور سخت مزاج فرشتے (مقرر) ہیں۔“

اس آیت مبارکہ میں اہل ایمان کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ خود بھی اور اپنے گھر والوں کی بھی اصلاح کا خاص اہتمام کریں تاکہ وہ سب جہنم کا ایندھن بننے سے بچ جائیں۔ امام زنجیزی

رحمہ اللہ ”تفسیر کشاف“ میں لکھتے ہیں:

”فَقُوًّا أَنْفُسِكُمْ“ کا مطلب یہ ہے کہ معاصی ترک کر کے اور طاعات بجالا کر اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ اور اپنے گھر والوں کو بھی اسی طرح آگ سے بچاؤ۔ اور جیسے تم اپنا مواخذہ اور محاسبہ کرتے ہو اسی طرح ان کا مواخذہ کیا کرو۔“

بچوں کی اصلاح و تربیت کی ذمہ داری اٹھانا والدین پر فرض ہے۔ ان کو اچھے کاموں کا عادی بنانا انتہائی ضروری ہے۔ یہی انبیاء و مرسلین ﷺ کا راستہ ہے۔ سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو ایمان لانے کی دعوت دی اور امام الناس سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنی اولاد کو صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کرنے کی وصیت کی۔ اس سلسلے میں سیدنا لقمان علیہ الرحمۃ کے طرز عمل کو قرآن حکیم میں سراہتے ہوئے تفصیلاً بیان کیا گیا ہے، جب وہ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہے تھے:

﴿وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَبْنِي لَكَ اللَّهُ إِنْ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴿۱۳﴾ ..... يَبْنِي لَكَ إِنْ تَكِ مَثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ أَوْ فِي السَّمَاوَاتِ أَوْ فِي الْأَرْضِ يَأْتِ بِهَا اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ ﴿۱۴﴾ يَبْنِي لَكَ الصَّلَاةَ وَأَمْرًا بِالْمَعْرُوفِ وَإِنَاءً عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَصْبِرْ عَلَى مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿۱۵﴾ وَلَا تَصْعَقْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْتَشِ فِي الْأَرْضِ مَرْحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴿۱۶﴾ وَأَقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ﴿۱۷﴾﴾ (لقمان)

”ذرا یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: پیارے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا، کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے..... اے میرے بیٹے! اگر (تیرا عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہو وہ خواہ کسی چٹان میں ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں! اللہ اسے نکال لائے گا۔ اللہ یقیناً بار یک بین اور باخبر ہے۔ پیارے بیٹے! نماز قائم کر، نیکی کا حکم کرو اور برے کام سے منع کرو، اور اگر تجھے کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر صبر کر۔ بلاشبہ یہ سب باتیں بڑی ہمت کے کام ہیں۔ اور (ازراہ تکبر) لوگوں سے اپنے گال نہ پھلا اور نہ زمین پر اکڑ کے چل (کیونکہ) اللہ کسی خود پسند اور شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں اعتدال کو ملحوظ رکھو اور اپنی آواز پست کرو بلاشبہ سب آوازوں سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔“

یہ ایک باپ کا اپنے بیٹے کے لیے وعظ و نصیحت اور علم و حکمت کو وہ خزانہ ہے جس پر عمل پیرا ہو کر نہ صرف اولاد دنیا اور آخرت کی تمام بھلائیاں سے فیض یاب ہو سکتی ہے بلکہ اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی بھی حاصل کر سکتی ہے۔ ایسی نیک اور صالح اولاد اپنے ماں باپ کے لیے اس دنیا میں آنکھوں کی ٹھنڈک اور آخرت میں ان کی مغفرت اور نجات کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ قرآن حکیم میں اسی حوالے سے دعا بتائی گئی ہے: ارشاد ہوا:

﴿وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِنَبِيِّنَا إِمَامًا ﴿۳۰﴾﴾ (الفرقان)

”اور جو (اللہ سے) دعا مانگتے ہیں کہ: اے ہمارے رب! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے (دل کا چین) اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔“

رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تربیت اولاد کے بنیادی اصول بتائے کہ:

((مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَنِينَ، وَاصْرُبُوهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ، وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ)) (سنن ابی داؤد: ۴۹۵)

”جب تمہارے بچے سات سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو انہیں نماز کی تلقین کرو اور دس سال کی عمر کے بچوں میں اس حوالے سے سستی دیکھو تو انہیں سرزنش کرو اور ان کے ہسٹرا لگ کر دو۔“

اسلام دین فطرت ہے۔ جب وہ کسی برائی کو روکنا چاہتا ہے تو اس طرف جانے والے راستوں پر قدغنیں لگا دیتا ہے۔ زنا جیسے کبیرہ گناہ سے بچنے کے لیے پردے کا حکم، مخلوط محفلوں میں شرکت پر پابندی، فحاشی اور عریانی کی مذمت کی گئی۔ اسی طرح بچے کے رحم مادر میں آنے سے پہلے ہی اس کی شخصیت کو ایک صالح انسان بننے کا سبب بھی پیدا فرما دیا گیا۔ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِذَا أُنِّي أَحَدُكُمْ أَهْلَهُ فَلْيَقُلْ: اللَّهُمَّ جَبِّتْنَا الشَّيْطَانَ وَجَبَّتِ الشَّيْطَانُ مَا رَزَقْتَنَا (متفق علیہ)

”جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس جانے کا ارادہ کرے تو یہ دعا کرے کہ: اے اللہ! ہم دونوں کو شیطان (کے شر) سے محفوظ رکھنا اور ہماری اس اولاد سے بھی شیطان کو

دور رکھنا جو تو ہمیں عطا فرمائے۔“

امام غزالی رحمہ اللہ اپنے رسالے ”اِيْتْهَا الْوَالِدُ“ میں لکھتے ہیں:

”تربیت کا مفہوم اس کاشت کار کے کام سے مشابہت رکھتا ہے جو زمین سے کانٹے نکالتا ہے اور کھیت میں سے ناموزوں گھاس وغیرہ اکھاڑ ڈالتا ہے تاکہ اس کی پیداوار اچھی ہو اور مکمل طور پر ہو۔“

ایک بارسیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عرب کے مشہور سردار احنف بن قیس کو اپنے پاس بلوایا اور ان سے دریافت کیا: ”ابو بحر! اولاد کے ساتھ سلوک کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“ احنف بن قیس نے کہا: ”اولاد ہماری دلی آرزوں کا ثمرہ اور کرکری ٹیک ہے۔ ہم اس کے لیے اس زمین کی طرح ہیں جو نہایت ہی نرم اور بالکل بے ضرر ہے۔ ہمارا وجود اولاد کے لیے اُس آسمان کی طرح ہے جو اس پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ ہم اسی کے سہارے بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کی ہمت کرتے ہیں۔ لہذا اولاد اگر آپ سے کوئی مطالبہ کرے تو خوش دلی کے ساتھ اسے پورا کیجیے۔ اگر وہ غمزدہ ہو تو اس کے دل کا غم دور کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ سے محبت کرے گی، آپ کی پدرانہ کوشش کو پسند کرے گی۔ آپ کبھی اس کے لیے ناگوار اور ناقابل برداشت بوجھ نہ بنیے کہ وہ آپ کی زندگی سے اکتا جائے، آپ کی موت چاہنے لگے اور آپ کے قریب آنے سے نفرت کرنے لگے۔“

اپنی اولاد کو پاکیزہ خیالات، تعمیری عادات و اطوار، مثبت عقائد و افکار اور صالح سیرت سے آراستہ کرنا ایک مسلمان باپ کی ذمہ داری ہے۔ اگر چہ ماں کی گود کو اولاد کے لیے پہلا مدرسہ قرار دیا گیا ہے، مگر بعض معاملات میں ماں مجبور و بے بس ہو جاتی ہے۔ زندگی کے اکثر معاملات میں حتمی اور آخری فیصلہ مردوں ہی کا ہوتا ہے۔ بعض گھرانوں میں ماں بچے کو کسی رنگ میں ڈھالنا چاہتی ہے جبکہ باپ اسے کسی اور ہی روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس طرز عمل کا ایک تشویش ناک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ بچے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ شک، تذبذب اور تردد ان کے مزاج کا حصہ بن جاتا ہے۔ وہ لوگوں کے نجوم میں رہ کر بھی خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔

بچہ ماں باپ کے پاس ایک امانت ہے۔ اس کا سادہ و صاف دل ہر نقش کو قبول کرتا ہے۔ اگر اسے نیکی کی عادت ڈالی جائے تو اس کی نشوونما اس پر ہوگی جبکہ اگر اسے برائی کی عادت ڈال

دی جائے تو وہ اسی میں بڑھتا چلا جائے گا۔ ایک سمجھدار باپ کا یہ اہم فریضہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو بری گفتگو، بری لوگوں کی مجلس سے دور رکھے، کیونکہ صحبت اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے۔ اچھی صحبت پاکیزہ ماحول اور دین داری کا راستہ بچے کی ذہنی نشوونما کا ضامن ہوتا ہے جبکہ برے صحبت اس کے کردار و عمل اور آئندہ زندگی کو گمراہی کی دلدل میں پھنسا دیتی ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے باپ کی ذمہ داری کو بڑے پُر زور اور تاکید آمیز انداز میں بیان فرمایا ہے:

”اہل علم کہتے ہیں کہ قیامت کے روز والد سے اس کی اولاد کے متعلق باز پرس ہوگی، کیونکہ جس طرح باپ کا اپنے بیٹے پر حق ہے اسی طرح بیٹے کا باپ پر حق ہے۔“

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

(( مَا مِنْ مَوْلُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَأَبْوَاهُ يَهُودَانِهِ، أَوْ يَنْصَرَانِهِ، أَوْ يُمَجْسِسَانِهِ )) (متفق علیہ)

”ہر بچہ فطرتِ سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔“

گویا ہر بچہ پیدائشی طور پر مسلمان ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اس کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر کرتے ہیں اور وہ جس رنگ میں چاہیں اسے ڈھال دیتے ہیں۔

ہماری قوم کا المیہ یہ ہے کہ والدین کا بچوں کی عصری تعلیم پر جتنا زور ہوتا ہے اور اس معاملے میں وہ جتنی حساسیت کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس کا چوتھائی حصہ بھی بچوں کی بہتر تربیت پر نہیں ہوتا۔ اعلیٰ تعلیم دلانے کے پیچھے یہ مقصد کارفرما ہوتا ہے کہ اولاد کو بہترین ملازمت ملے اور اس کا معیار زندگی جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانا کوئی معیوب بات نہیں، لیکن مقصد محض دنیا اور اس کی لذتوں کا حصول نہ ہو۔ یہ دنیا اور اس کے تمام وسائل زندگی گزارنے کے ذرائع ہیں جو قدرت نے ہمیں عطا کیے ہیں، لیکن ان ہی میں دل لگا کر بیٹھ جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ بقول اکبر الہ آبادی:

دُنیا میں ہوں، دُنیا کا طلب گار نہیں ہوں

بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں!

تربیتِ اولاد میں باپ کا کردار کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ جب تک وہ اپنی اولاد کی قرآن و

سنت کی تعلیمات کے مطابق تربیت نہیں کرے گا، اس کا بچہ نہ اچھا باپ بن سکتا ہے نہ اچھا بھائی، نہ اچھا بیٹا اور نہ اچھا شوہر۔ اسی طرح کوئی عورت کسی بھی روپ میں ہو، وہ نیکی کے راستے پر نہیں چل سکتی جب تک ہدایت کی روشنی اس کی زندگی میں نہ آجائے۔ دولت، تعلیم، طاقت، ذہانت، علمی اور فنی صلاحیت کچھ بھی نعمت نہیں کہلا سکتی جب تک اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ہدایت تامہ اسے حاصل نہ ہو۔ خالق کائنات کی ہدایت اور رہنمائی انسان کے ساتھ نہ ہو تو بسا اوقات بڑے سے بڑا علم اس کی بدبختی اور خسارے کا موجب بن جاتا ہے۔ جب محض دنیا ہی پیش نظر ہو اور اللہ کا دین نظروں سے اوجھل رہے تو انسان کی دنیوی کامیابی بھی اس کے لیے آخرت میں وبالِ جان بن جائے گی۔

ہمارے معاشرے میں اکثریت ایسے والدین کی ہے جو سوچتے ہیں کہ دنیا میں وہ خود جن آسائشوں، مادی لذتوں اور اکل و شرب کی حلاوتوں سے محروم رہے، ان کا بچہ ان چیزوں سے تہی دست نہ رہ جائے۔ اس دیرینہ خواہش کی تکمیل میں بعض اوقات ان سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں بھی سرزد ہوتی ہیں۔ شیطان دنیا کی لذتوں کو انسان کی نظروں میں مزین کر کے دکھاتا ہے۔ یوں انسان اس فانی دنیا کی بھول بھلیوں ہی میں بھٹکتا رہتا ہے۔ والدین کی سعادت اور نیک بختی یہ ہے کہ وہ اولاد کی مثالی تربیت کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((أَكْرِمُوا أَوْلَادَكُمْ وَ أَحْسِنُوا أَدْبَارَهُمْ)) (سنن ابن ماجہ: ۳۶۷۱)

”اپنی اولاد کو عزت دو اور ان کی اچھی تربیت کرو۔“

مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اپنی تصنیف ”اخلاق اور فلسفہ اخلاق“ میں رقم طراز ہیں:

”وہ باپ یقیناً خطا کار ہے جو پہلے ہی یہ طے کر لے کہ میرا بیٹا عنقریب طبیب یا مہندس یا قاضی بنے گا اور پھر اس کو مقرر کر دہ محدود راہ پر چلنے کے لیے مجبور کرے۔ اس لیے کہ بسا اوقات اُس میں طب، ہندسہ یا قانون کی استعداد نہیں ہوتی۔ مگر وہ باپ صواب پر ہے جو اپنے بیٹے کے لیے یہ طے کر لے کہ وہ اس کو امین، شجاع اور صاحب فضل بنائے گا۔ اس لیے کہ وہ ابھی لڑکا ہے اور اس میں کسی نہ کسی حد تک ان اخلاقِ فاضلہ کی استعداد موجود ہے۔ صحیح تربیت کے ذریعے سے نفسیات مبادیات اور ان کے قوانین کی معرفت و تعلیم پر انسان کی قدرت ہو سکتی ہے۔“

اسلام اوائل عمری ہی سے بچوں کو اسلامی امور سکھانے کی تاکید کرتا ہے تاکہ جب وہ

باشعور ہو جائیں تو ان کے دل میں خوفِ خدا پیدا ہو چکا ہو۔ اپنے معبودِ حقیقی کی عبادت، اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا ذوق و شوق اپنے دل میں رکھتے ہوں۔ باپ اگر اپنے بچے کی تربیت اسلامی خطوط پر کرتا ہے تو بچے کے اندر اللہ کی خشیت اور اطاعت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ صالح زندگی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ باپ کی یہ نیکی اجر و ثواب کے لحاظ سے دائمی نیکی بن جاتی ہے۔ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

((إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ

جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ)) (صحیح مسلم: ۱۶۳۱)

”جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، مگر اس کے تین عمل

باقی رہتے ہیں: ایک صدقہ جاریہ، دوم وہ علم جس سے استفادہ کیا جا رہا ہو اور سوم وہ نیک

اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہو۔“

مذکورہ قرآنی آیات اور فرموداتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ بچے کی بہترین تربیت کرنے کی تمام تر ذمہ داری والدین پر ہے، خاص طور پر اس فکری اور عملی جدوجہد میں باپ کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ باپ خاندان کا سربراہ ہے۔ انسانی معاملات میں اس کا فیصلہ حتمی مانا جاتا ہے، کہیں زور زبردستی سے، کہیں رضامندی سے تو کبھی مصلحتاً! اس لیے دیکھا جائے گا کہ اس نے اپنی اولاد کو دنیا سمیٹنے کے داؤ پیچ سکھائے یا اس کے اندر دین داری اور خشیتِ الہی کے لیے بھی کوئی سعی و جہد کی۔

ارشاد رب العزت ہے:

﴿فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاعِقَةُ ۗ ۳۳ يَوْمَ يَفُوقُ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۗ ۳۴ وَأُمُّهُ وَأَبِيهِ ۗ ۳۵

وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۗ ۳۶ لِكُلِّ أُمَّرٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۗ ۳۷﴾ (عبس)

”تو جب کان بہرے کر دینے والی (قیامت) آجائے گی، اس دن آدمی اپنے بھائی سے

دور بھاگے گا اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور بیٹے سے۔ ان میں سے ہر

شخص کو اُس روز ایک ہی فکر لاحق ہوگی جو اُسے (ہر ایک سے) بے پروا کر دے گی۔“

فاعتبروا يا أولى الأبصار!



# گھر: ہماری دعوت کا اولین میدان

شعبہ تعلیم و تربیت

گھر انسانی معاشرہ کی بنیادی اکائی ہے۔ بہت سے گھر مل کر ایک محلہ بناتے ہیں۔ پھر بہت سے محلے مل کر گاؤں اور قصبہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اسی طرح شہر، ملک اور خطے وجود میں آتے ہیں۔ چنانچہ اگر ہر گھر درست ہو جائے تو معاشرہ درست ہو سکتا ہے۔

دنیا میں انسان کے لیے سب سے زیادہ سکون کی جگہ گھر ہی ہوتا ہے۔ یہاں ایک ساتھ رہنے والے لوگ ایک دوسرے کے لیے قرب اور محبت رکھتے ہیں۔ والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد کا مستقبل سنور جائے، انہیں اپنی آئندہ زندگی میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ تقریباً تمام والدین ہی اپنی سمجھ اور ترجیحات کے مطابق اپنے گھر کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ کے نزدیک سماجی رویے بہت اہم ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کے نزدیک مال و دولت کی اہمیت ہوتی ہے، وہ اپنی اولاد کو مال کمانے کے گڑھ سکتے ہیں۔ مقتدر طبقات کے لوگ اپنی اولاد کو حکمرانی کے طور طریق اور سیاست سکھاتے ہیں۔ تاہم عام لوگوں کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ ان کی اولاد تعلیم حاصل کرے، پڑھ لکھ کر ایک اچھی نوکری یا اعلیٰ کاروبار کرے۔ ماڈی طور پر سبھی والدین اپنی اولاد کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنی اولاد کو اچھا کھلائیں، اچھا پہنائیں اور اچھی جگہ ان کی شادی کریں۔

سربراہ خاندان کی اس سے بڑھ کر بھی ایک بہت اہم ذمہ داری ہے جس کی طرف عموماً توجہ نہیں دی جاتی۔ وہ ہے اپنے اہل و عیال کی آخرت کی کامیابی اور فوز و فلاح کی فکر کرنا تاکہ وہ جنت میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکیں اور جہنم کے ابدی عذاب سے بچ جائیں۔ سورۃ التحريم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقْوُهَا النَّاسُ وَالْجِبَارَةُ

عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غُلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴿٥١﴾

”اے اہل ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ سے جس کا ایندھن نہیں گے انسان اور پتھر، اس پر بڑے تندخو، بہت سخت دل فرشتے مامور ہیں، اللہ ان کو جو حکم دے گا وہ (فرشتے) اس کی نافرمانی نہیں کریں گے اور وہ وہی کریں گے جس کا انہیں حکم دیا جائے گا۔“

اس آیت کی تشریح میں بانی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”آیت زیر مطالعہ میں اہل ایمان کو ان کے اہل و عیال کے بارے میں خبردار کیا جا رہا ہے کہ بحیثیت شوہر اپنی بیویوں کو اور بحیثیت باپ اپنی اولاد کو دین کے راستے پر ڈالنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ یہ مت سمجھو کہ ان کے حوالہ سے تمہاری ذمہ داری صرف ضروریات زندگی فراہم کرنے کی حد تک ہے بلکہ ایک مومن کی حیثیت سے اپنے اہل و عیال کے حوالہ سے تمہارا پہلا فرض یہ ہے کہ تم انہیں جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر کرو۔ اس کے لیے ہر وہ طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کرو جس سے ان کے قلوب و اذہان میں دین کی سمجھ بوجھ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اور آخرت کی فکر پیدا ہو جائے تاکہ تمہارے ساتھ ساتھ وہ بھی اس جہنم کی آگ سے بچ جائیں۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ جہنم پر مامور فرشتے مجرموں کو جہنم میں جلتا دیکھ کر ان پر رحم نہیں کھائیں گے اور نہ ہی ان کے نالہ و شہین سے متاثر ہوں گے۔ تو کیا ہم ناز و نعم میں پلے اپنے لاڈلوں کو جہنم کا ایندھن بننے کے لیے ان سخت دل فرشتوں کے سپرد کرنا چاہتے ہیں؟ ہم میں سے ہر ایک کو اس زاویہ سے اپنی ترجیحات کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا ہم اپنے اہل و عیال کو جنت کی طرف لے جا رہے ہیں یا جہنم کا راستہ دکھا رہے ہیں؟

اپنے بہترین وسائل خرچ کر کے اپنی اولاد کو جو تعلیم ہم دلوار ہے ہیں، کیا وہ ان کو دین کی طرف راغب کرنے والی ہے یا ان کے دلوں میں بغاوت کے بیج بونے والی ہے؟ اگر تو ہم اپنے اہل و عیال کو اچھے مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کر رہے اور ان کے لیے ایسی تعلیم و تربیت کا اہتمام نہیں کر رہے جو انہیں دین کی طرف راغب کرنے اور فکرِ آخرت سے آشنا کرنے کا باعث بنے تو ہمیں جان لینا چاہیے کہ ہم محبت کے نام پر ان سے عداوت کر رہے ہیں۔“ (بیان القرآن، جلد چہارم، صفحہ ۵۰۸)



آئیے احادیث نبویہ ﷺ کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کی کیا اہمیت ہے اور اس کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

”اپنے بچوں کی زبان سے سب سے پہلے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہلو اور موت کے وقت ان کو اسی کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی تلقین کرو۔“ (شعب الایمان للبیہقی)

انسانی ذہن کے بارے میں جدید تجربات اور تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ پیدائش ہی کے وقت سے بچے کے ذہن میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ جو آوازیں وہ کان سے سنے اور آنکھوں سے جو کچھ دیکھے اس سے اثر لے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بچے کی پیدائش کے فوراً بعد اس کے دائیں کان میں اذان کہنے کی تلقین فرمائی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سِنِينَ، وَاصْرِبُوا لَهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ، وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَصَاحِبِ)) (سنن أبي داود)

”تمہارے بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز کی تلقین کرو۔ اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو نماز میں کوتاہی پران کو سزا دو اور ان کے بستر بھی الگ کرو۔“

بچے سات سال کی عمر میں سجدہ دار اور باشعور ہو جاتے ہیں۔ اس عمر میں ان کو خدا پرستی کے راستے پر ڈالنا چاہیے اور اس کے لیے ان سے نماز کی پابندی کرانی چاہیے۔ دس سال کی عمر میں ان کا شعور کافی ترقی کر جاتا ہے اور ان کے بلوغ کا زمانہ بھی قریب آ جاتا ہے۔ اس وقت نماز کے بارے میں ان پر سختی کرنی چاہیے اور اگر وہ کوتاہی کریں تو مناسب طور پر ان کی سرزنش بھی کرنی چاہیے۔

انبیاء کرام ﷺ نے بھی دعوت و تبلیغ کے لیے یہی طریق کار اختیار کیا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے والد آزر کو دین کی دعوت دی، جس کا تذکرہ سورۃ مریم میں موجود ہے۔

﴿إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا ۗ﴾

يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ يَا أَبَتِ فَأَنْتَ عِبْتَهُ عَصَاكَ ۗ إِنِّي كَرِهتُ أَنْ يَكُونَ لِي مِنْكُمْ شُرَكَاءُ ۖ فَمَا أُبَدِّلُكَ حَتَّىٰ تَأْمَنَ بِي ۖ إِنِّي أَخَافُ

أَنْ يَكُونَ لِي مِنَ الْكُفْرَانِ ۗ وَلَئِن لَّمْ يَظُنْ عَلَيَّ رَبِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمُ الَّذِينَ يُشْرِكُونَ بِاللَّهِ ۗ وَإِنِّي أَخَافُ

﴿﴾

”یاد کیجیے جب ابراہیم نے اپنے والد سے کہا: ابا جان! آپ کیوں بندگی کرتے ہیں ایسی

چیزوں کی جو نہ سن سکتی ہیں اور نہ دیکھ سکتی ہیں اور نہ ہی آپ کے کچھ کام آسکتی ہیں۔ ابا جان! یقیناً میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا، پس آپ میری پیروی کیجیے، میں آپ کو دکھاؤں گا سیدھا راستہ۔ ابا جان! آپ شیطان کی بندگی نہ کیجیے، شیطان یقیناً رحمن کا نافرمان تھا۔ ابا جان! مجھے اندیشہ ہے کہ رحمن کی طرف سے کوئی عذاب آپ کو آپکڑے اور پھر آپ شیطان ہی کے ساتھی بن کر رہ جائیں۔“

”يَا أَبَتِ“ کی تکرار سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام انتہائی محبت اور دل سوزی کے ساتھ باپ کو سمجھا رہے ہیں کہ آپ شیطان کی بندگی مت کیجیے اور میری پیروی کیجیے، میں آپ کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔ آخرت کے برے انجام سے بھی خبردار کرتے ہیں۔ اپنے والد اور اولاد کے لیے اللہ تعالیٰ سے نماز کا عادی بنانے، بالفاظ دیگر سیدھے راستے پر چلانے کی دعا کرتے ہیں۔ اپنے والدین کے لیے استغفار کی دعا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام باتیں ہماری رہنمائی کے لیے درج کی ہیں کہ اپنے اہل و عیال، والدین سے محبت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ انہیں سیدھے راستے پر چلانے کی کوشش کی جائے اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کی جائے۔

نبی اکرم ﷺ کی دعوت میں بھی ہمیں یہی انداز نظر آتا ہے۔ سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں آپ ﷺ کی اہلیہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، پچازاد بھائی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور جگری دوست حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ شامل ہیں۔

اہل خانہ کی تربیت بہت شفقت اور ہمدردی کے ساتھ کرنی چاہیے۔ کبھی کبھی تادیب کے لیے سختی بھی ضروری ہوتی ہے، مگر اس سختی کا استعمال بھی حکمت کے ساتھ ہونا چاہیے۔ حد سے زیادہ مار پیٹ کے نتائج الٹ نکلتے ہیں کہ بچے تعلیم ہی سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں اردو کی یہ ضرب المثل ذہن میں رہنی چاہیے کہ: ”کھلائے سونے کا نوالہ دیکھے شیر کی نظر۔“

اہل و عیال کی محبت حد اعتدال سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ سورۃ التغابن میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَرْوَاحِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ ۗ وَإِن تَعَفَوْا

وَإِن تَعَفَوْا وَ تَصَفَّحُوا وَ تَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٥﴾

”اے ایمان کے دعوے دارو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے

دشمن ہیں، سوان سے بچ کر رہو۔ اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔“

آج ہمارے معاشرے کے روایتی مسلمانوں کو تو بیوی بچوں کی دشمنی والی بات سمجھ میں ہی نہیں آئے گی۔ البتہ اگر کوئی بندہ مومن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کسی انقلابی تحریک کے کارکن کی حیثیت سے اقامت دین کی جدوجہد میں مصروف ہو تو اس پر یہ حقیقت بہت جلد واضح ہو جاتی ہے کہ اس راستے میں بیوی بچوں کی محبت کس طرح پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔ بیوی کی بے جا فرمائشیں، بچوں کی حد سے بڑھی ہوئی ضروریات، اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ان کی تعلیم کے اخراجات اگر حلال کی کمائی سے پورے نہیں ہوں گی تو انسان کیا کرے گا۔ یا تو حرام میں منہ مارے گا یا ڈالر کمانے ملک سے باہر جائے گا۔ دونوں صورتوں میں بچوں کی اسلامی خطوط پر تربیت نہ ہو سکے گی اور ان کی آخرت برباد ہو کر رہ جائے گی۔

یہ معاملہ چونکہ بہت نازک اور حساس ہے اس لیے اگلے جملے میں یہ تلقین کی جا رہی ہے کہ اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے اپنے اہل و عیال کے معاملات کو نرمی اور حکمت سے نمٹاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ صبح و شام تمہارا گھر میدان جنگ کا نقشہ پیش کرنے لگے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ)) (متفق علیہ)

”تم میں سے ہر آدمی نگہبان ہے اور ہر آدمی اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔“

اس حدیث مبارکہ کے مطابق ہم اپنے اہل خانہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہ ہیں کہ ان کے ضمن میں ہم نے اپنی ذمہ داری نبھائی یا نہیں۔ اسی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے تنظیم اسلامی کے ملترزم رفقاء کے لیے یہ لازم کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال اور اپنے زیر کفالت افراد کی تربیت کے لیے ایک ”گھریلو اسرہ“ کا قیام عمل میں لائیں۔ مبتدی رفقاء اور احباب کو چاہیے کہ وہ بھی اپنے اہل خانہ کی تربیت کے لیے ”گھریلو اسرہ“ ضرور قائم کریں۔ سربراہ خاندان خود اس اسرہ کا منتظم ہو اور خاتون خانہ اس کام میں شوہر کی معاونت کریں۔ بہتر ہوگا کہ یہ مجلس ہفتہ وار منعقد کی جائے اور اس کا دورانیہ کم از کم ایک گھنٹہ ہو۔

اسرہ کا نصاب ذیل میں تجویز کیا جا رہا ہے، جس کی ذمہ داری گھرانہ کے مختلف افراد مل جل کر نبھائیں:

- (۱) تلاوت اور ترجمہ قرآن
  - (۲) آداب زندگی (محمد یوسف اصلاحی) سے بنیادی اخلاقیات کا مطالعہ
  - (۳) سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ترجمہ الریحق المختوم) کا سلسلہ وار مطالعہ
  - (۴) سیرت صحابہ / صحابیات رضی اللہ عنہم کا مطالعہ
  - (۵) مشہور دینی شخصیات کے دل افروز واقعات
- عمر کے مختلف ادوار میں تعلیم و تربیت کا انداز تبدیل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دس سال کی عمر تک پیار محبت سے، اس کے بعد ملکی پھلکی سختی اور پھر جوانی کے دور میں صرف دلائل اور محبت کے ساتھ بات سمجھانی چاہیے۔

دورِ حاضر میں سکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم نہ صرف سیکولر ہے بلکہ دین سے دور کرنے والی بھی ہے۔ یہ ایمان میں شکوک پیدا کرتی ہے۔ اس کائنات کے علم کو ہی اصل علم قرار دیتی ہے۔ طبیعیات کے قوانین کو حتمی قرار دیتی ہے۔ تعلیم کا پورا زور جسم، کائنات اور حیات دنیوی کی طرف ہے۔ اللہ، روح اور حیاتِ اُخروی کی طرف بالکل توجہ نہیں۔ ان حالات میں تو اب ہماری ذمہ داری اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ گھر پر بچوں کی دینی تعلیم کا بندوبست کریں اور مروجہ تعلیمی اداروں کی پھیلانی ہوئی گمراہی اور مغالطوں کو دور کرنے کی فکر کریں۔ اس کے ساتھ خود بھی دین کو قائم کرنے کی جدوجہد میں حصہ لیں اور اس میں اپنے اہل و عیال کو بھی شریک کریں، تاکہ غلبہ دین کی راہ ہموار ہو سکے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے اہل و عیال کی تربیت کے ضمن میں ہماری مدد فرمائے۔ ہمارے والدین اور ہمارے اہل و عیال سمیت تمام مومنین کی مغفرت فرمائے۔ آمین

یارب العالمین! ❀❀❀

میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن  
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ [www.tanzeem.org](http://www.tanzeem.org) پر ملاحظہ کیجیے۔

## انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت اور فضیلت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اللہ تعالیٰ کائنات کا نہ صرف خالق ہے بلکہ مخلوق کے ہر فرد کا رازق بھی ہے۔ کائنات میں مخلوق کی لاتعداد انواع ہیں۔ انسان ایک باشعور مخلوق ہے۔ ہم اگرچہ خود محنت کر کے خود روزی کماتے ہیں تاہم اس سلسلہ میں یہ پابندی عائد کی گئی ہے کہ ہم جائز طریقے اور ذریعے استعمال میں لائیں۔ روزی رساں اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے روزی وافر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تھوڑی مقدار میں دیتا ہے۔

دوسرے حیوانات کے برعکس انسان مرنے کے بعد غیر مسؤل نہیں۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ اُس نے خالق کی ہدایات کے مطابق محنت کر کے روزی کمائی یا اس مقصد کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کیے۔ یہ بھی پوچھا جائے گا کہ جو روزی اس نے کمائی، اسے جائز کاموں میں خرچ کیا یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے کاموں میں ضائع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر لازم کیا ہے کہ وہ اپنی کمائی میں سے غریب، محتاج اور فقیر لوگوں کی مدد کرے۔ اس سلسلہ میں زکوٰۃ کا ادا کرنا تو فرض کیا گیا ہے، تاہم اس کے علاوہ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ مسلمانوں کو مال جمع کرنے سے روکا گیا ہے تاکہ دولت صرف اہل ثروت کے درمیان ہی گردش میں نہ رہے۔ فرمان الہی ہے: ﴿وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ١٩﴾ (الذَّهَبُ) یعنی مال داروں کے اموال میں غریبوں کا حق ہے خواہ وہ مانگتے ہیں یا نہیں مانگتے۔ اس طرح سے خرچ کیے گئے مال کو اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ فرض گردانتا ہے جس کے بدلے میں آخرت میں اجر عظیم ملے گا۔

نماز کی طرح زکوٰۃ بھی ارکانِ اسلام میں سے ہے جو ہر صاحبِ نصاب پر ہر سال ادا کرنا فرض ہے۔ سال بھر میں کل جمع شدہ مال پر زکوٰۃ کی شرح اڑھائی فیصد ہے۔ قرآن مجید میں بار بار

بار اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ روزی زیادہ دینا یا کم دینا اللہ تعالیٰ کا اختیار اور اس کی مرضی ہے، جس کسی کو جو مال ملا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ ہے۔ اس مال میں سے ایک سال کے بعد چالیسواں حصہ غریب اور محتاج لوگوں میں تقسیم کر دینا کوئی مشکل نہیں۔ جو کوئی اس کو بھی مشکل سمجھتا ہو اور ادا نہ کرتا ہو اس کو سخت عذاب کی وعید ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَبْشِرُهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ٣٣ يَوْمَ يُخْفَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارٍ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ٣٤﴾ (التوبة)

”جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے ان کو اُس دن کے عذابِ الیم کی خبر سنا دو۔ جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں خوب گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا) یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا سو جو تم جمع کرتے تھے (اب) اس کا مزہ چکھو۔“

یہ تو حکم ہے زکوٰۃ کی ادائیگی کا۔ اس عذاب کا مستحق وہ شخص ہے جس نے اپنے مال کی زکوٰۃ بھی ادا نہیں کی۔ یہی مال آخرت میں اس کے لیے عذاب بن جائے گا۔ اپنی وفات کے وقت وہ شخص پچھتائے گا اور کہے گا کہ کاش مجھے کچھ مہلت مل جائے تو میں اپنا مال صدقہ کر دوں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَأَنْفِقُوا مِنْ مَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ لَّفَاصَّدَقَ وَأَكُن مِنَ الضَّالِّحِينَ ١٥ وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ١٦﴾ (المنفقون)

”اور جو (مال) ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے اُس وقت سے پہلے خرچ کر لو کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے تو (اس وقت) وہ کہنے لگے: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی سی اور مہلت کیوں نہ دی تاکہ میں خیرات کر لیتا اور نیک لوگوں میں داخل ہو جاتا۔ اور جب کسی کی موت آجاتی ہے تو اللہ اس کو ہرگز مہلت نہیں دیتا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔“

ظاہر ہے کہ جب مہلت عمر ختم ہو جائے گی تو اس کو ایک لمحہ کی بھی extension نہیں ملے گی اور اس وقت کا پچھتاوا کسی کام نہ آئے گا۔ زکوٰۃ کے علاوہ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ضرورت مندوں اور مسکینوں پر خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((إِنَّ فِي الْمَالِ لِحَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ)) (سنن الترمذی: ۶۵۹) ”یقیناً مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی (اللہ کا) حق ہے۔“ پھر آپ ﷺ نے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ تلاوت فرمائی، جس میں (زکوٰۃ کے علاوہ) قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوا لیوں اور گردن چھڑانے میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر فرض زکوٰۃ کے علاوہ انفاق مال کی ترغیب ملتی ہے۔

﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۗ قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَالرِّسَالَةِ ۗ وَمَا تَفْعَلُونَ مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿۱۷۷﴾﴾ (البقرۃ)

”(اے نبی ﷺ!) یہ آپ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں؟ کہہ دو کہ جو کچھ تم مال خرچ کرو سوا ماں باپ کے لیے، قریب داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔“

یہ خرچ کرنا زکوٰۃ کے علاوہ ہے اس لیے کہ اس میں والدین پر خرچ کرنے کا ذکر ہے اور والدین کو تو زکوٰۃ دی ہی نہیں جاسکتی۔ قرآن مجید میں یہ بھی ارشاد ہے: ﴿وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۗ قُلِ الْعَفْوَ﴾ (البقرۃ: ۲۱۹) ”آپ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے جو بھی زائد از ضرورت ہو۔“ اسی لیے ہر امیر غریب کو اپنی حیثیت کے مطابق صدقہ کرنا چاہیے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ”جب آدمی اپنے گھر والوں پر ثواب اور اجر کی امید رکھ کر خرچ کرتا ہے تو یہ اس کے لیے صدقہ شمار ہوتا ہے۔“ (متفق علیہ)

صدقہ کی ترغیب دیتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ((أَنْفِقْ يَا ابْنَ آدَمَ أَنْفِقْ عَلَيْنِكَ)) (صحیح البخاری: ۵۳۵۲) ”اے آدم کے فرزند! تو میرے ضرورت مند بندوں پر اپنی کمائی میں سے خرچ کر، میں (اپنے خزانہ غیب سے) تجھ کو دیتا رہوں گا۔“

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا:

ماہنامہ **میناق** (55) اکتوبر 2024ء

”تم اللہ کے بھروسے پر اس کی راہ میں کشادہ دستی سے خرچ کرتی رہو اور گنومت۔ اگر تم اس کی راہ میں اس طرح حساب کر کے دو گی تو وہ بھی تمہیں حساب ہی سے دے گا۔ اور دولت جوڑ جوڑ کر اور بند کر کے نہ رکھو، ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تمہارے ساتھ یہی معاملہ کرے گا۔ لہذا تھوڑا بہت جو ہو سکے اور جس کی توفیق ملے، راہ خدا میں کشادہ دستی سے دیتی رہو۔“ (بخاری و مسلم)

انسان کے اندر لالچ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، جس کی مذمت قرآن حکیم میں کئی مقامات پر مذکور ہے۔ انسان غفلت میں اس قدر آگے نکل جاتا ہے کہ اسے اپنی موت یا نہیں رہتی جو ایک اٹل حقیقت ہے۔ وہ آخرت کی زندگی بھی بھول جاتا ہے، جس پر یقین تو مسلمان کا بنیادی عقیدہ ہے۔

﴿أَلْهَيْكُمْ التَّكَاثُرُ ۚ ۱ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۗ ۲ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ ۳ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ ۴ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۚ ۵ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ۚ ۶ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۚ ۷ ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۗ ۸﴾ (التكاثر)

”لوگو! تم کو مال کی بہت سی طلب نے غافل کر دیا، یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔ دیکھو عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ پھر دیکھو عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ دیکھو اگر تم جانتے یعنی علم یقین رکھتے (تو غفلت نہ کرتے)۔ تم ضرور دوزخ دیکھو گے۔ پھر اس کو ایسا دیکھو گے کہ عین یقین آجائے گا۔ پھر اس روز تم سے (شکر) نعمت کے بارے میں پرسش ہوگی۔“

رضائے الہی کے لیے جو رقم خرچ کی جائے گی، اللہ تعالیٰ اسے اپنے ذمہ قرض شمار کرتا ہے۔ وہ اس کو بڑھا چڑھا کر واپس دے گا اور گناہوں کو بخش دے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنْ تَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضْعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ شَكُورٌ ۝ حٰلِيْمٌ ۝﴾ (التغابن)

”اگر تم اللہ کو قرض حسنہ دو گے تو وہ اس کو دو چند کر دے گا اور تمہارے گناہ بھی معاف کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ قدر شناس اور بردبار ہے۔“

مال و دولت بچا بچا کر رکھنے کے نقصان کو واضح کر دیا گیا اور نبی سبیل اللہ خرچ کرنے کا نفع بھی بتا دیا گیا۔ یہ فائدہ اس وقت ملے گا جب نیکیاں کمانے کا موقع ختم ہو چکا ہوگا اور انسان انتہائی بے بس ہوگا۔ اسی لیے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ ہر شخص فکر مند رہے۔ دنیاوی زندگی کے

ماہنامہ **میناق** (56) اکتوبر 2024ء

جائز فوائد حاصل کرنے کی اجازت ہے مگر اس میں خدا فراموشی کی حد تک مشغول ہو جانا برے انجام تک پہنچا دیتا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۗ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ (الحشر)

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھے کہ اس نے کل (یعنی قیامت) کے لیے کیا سامان آگے بھیجا ہے! (ہم پھر کہتے ہیں کہ) اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔“

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔  
سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوا:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلٍ فِي كُلِّ سَنَابِلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٌ ۗ وَاللَّهُ يُضْعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ (۳۶)

”مثال اُن کی جو اپنے مال اللہ کی راہ میں (اللہ کے دین کے لیے) خرچ کرتے ہیں ایسے ہے جیسے ایک دانہ کہ اُس سے سات بالیاں (خوشے) پیدا ہوں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اللہ جس کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے۔ اور اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔“

جو شخص پُر خلوص ہو کر اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اس کی معمولی سی رقم کوئی گنا شمار کیا جائے گا۔

ریا کاری کسی بڑی سے بڑی نیکی کو بھی ضائع کر دیتی ہے۔ اسی طرح اگر فی سبیل اللہ خرچ

کرتے وقت دکھاوا پیش نظر ہو یا شہرت مطلوب ہو تو ایسا صدقہ نامقبول ہے۔ ایسے لوگوں کو کہا

جائے گا کہ تم نے جن کو خوش کرنے کے لیے خرچ کیا تھا اب انہی سے اجر طلب کرو کیونکہ

اللہ تعالیٰ تو صرف اسی صدقہ یا خیرات کو قبول کرتا ہے جس کا مقصد رضائے الہی کا حصول ہو۔

﴿وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالْبَتِّ تَقَرَّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفَىٰ إِلَّا مَنْ آمَنَ

وَعَمِلَ صَالِحًا ۖ فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الضَّعْفِ بِمَا عَمِلُوا وَهُمْ فِي الْغُرُفَاتِ

أَصْنُوفٍ﴾ (سبا)

”اور (دیکھو!) تمہارے اموال اور تمہاری اولاد ایسی چیزیں نہیں کہ وہ تمہیں مرتبے میں

ماہنامہ میثاق (57) اکتوبر 2024ء

ہمارا مقرب بنا دیں سوائے اُس شخص کے جو ایمان لایا اور اُس نے نیک اعمال کیے۔ تو ایسے لوگوں کے لیے ان کے اعمال کا دو گنا اجر ہے اور وہ بالا خانوں میں امن سے رہیں گے۔“

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے متعدد مواقع ہیں۔ انہی میں سے ایک یہ ہے کہ اسلام کی سر بلندی کے لیے خرچ کیا جائے تاکہ دُنیا میں عدل کا نظام قائم ہو۔ باطل نظام میں سودی معاملات کا دور دورہ ہوتا ہے اور ناداروں کی مدد کا کوئی قانون نہیں۔ یہ فکر عام ہوتی ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو وہ خود غریبوں کی مدد کرتا۔ اس کے برعکس، عدل کا نظام دنیا میں صحت مند معاشرہ قائم کرتا ہے۔ اسلام سلامتی کا دین ہے۔ جب اسلام کے احیاء کی کوشش کی جائے گی تو امن قائم ہوگا اور مخلوق خدا کو آسودگی حاصل ہوگی۔ یہ ایک طرح سے جہاد ہے جسے اختیار کرنا بھی فضیلت کا باعث ہے۔ مالی جہاد کا موقع ہر وقت موجود ہوتا ہے اور یہ مال خرچ کرنے کی بہترین صورت بھی ہے۔

دُنیا کے مال کی محبت خسارے کا سودا ہے جبکہ انفاق فی سبیل اللہ میں حقیقی کامیابی ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرے۔ سود سے بظاہر تو مال میں اضافہ ہوتا ہے لیکن آخر کار یہ معاشی نظام کو برباد کر دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيلُ الصِّدْقَ﴾ (البقرۃ: ۲۷۶)

”اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔“

تاریخ کے صفحات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ کوئی سخی جب انفاق کرتا ہے تو وہ کبھی نادار نہیں ہوتا۔ اگر اس بات پر پختہ یقین ہو کہ روزی اللہ ہی دیتا ہے تو اُسی کے دیے ہوئے مال میں سے فی سبیل اللہ خرچ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔



## جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت، اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

ماہنامہ میثاق (58) اکتوبر 2024ء

## چند مہلک منکرات

حافظ محمد اسد ☆

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر اس دنیا میں بطور آزمائش بھیجا ہے۔ قدم قدم پر انسان کی جانچ ہوتی ہے کہ یہ اس میں پورا اترتا ہے یا نہیں۔ کبھی انسان کو بہت کچھ دیا جاتا ہے جبکہ کبھی سب کچھ لے کر آزما یا جاتا ہے۔ ہر انسان کو درپیش مسائل مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں اور وہ اپنے اعمال کا حساب بھی اپنے شاکلہ (مزاج و طبیعت) کے لحاظ ہی سے دے گا۔ موجودہ دور کا انسان احکامات الہی کو جس طرح پس پشت ڈال رہا ہے اس کی مثال ملنا بہت مشکل ہے۔ ستم یہ کہ اسے یہ شعور و ادراک بھی نہیں کہ مجھ سے کتنے سنگین گناہ سرزد ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ توبہ و استغفار کرنا بھی اب رسماً ہی باقی رہ گیا ہے جو خاص مواقع پر ہی کیا جاتا ہے۔ اس دور کے حوالے سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((بَادِرُوا بِالْأَعْمَالِ فِتْنًا كَقَطْعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ، يُضْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَيُؤْمِسِي كَافِرًا، أَوْ يُؤْمِسِي مُؤْمِنًا وَيُضْبِحُ كَافِرًا، يَبِيعُ دِينَهُ بَعْرَضٍ مِنَ الدُّنْيَا)) (صحیح مسلم: ۳۱۳)

”ان فتنوں سے پہلے پہلے جو تار یک رات کے حصوں کی طرح (چھا جانے والے) ہوں گے (نیک) اعمال کرنے میں جلدی کرو۔ (ان فتنوں میں) صبح کو آدمی مومن ہوگا اور شام کو کافر یا شام کو مومن ہوگا تو صبح کو کافر۔ اپنا دین (ایمان) دنیوی سامان کے عوض بیچتا ہوگا۔“

شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: جنوری ۲۰۰۱ء) اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

”اہم بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اندھیری رات کے فتنوں سے خبردار فرمایا، جس میں انسان صبح مومن ہوگا تو شام کو کافر ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت

☆ استاذ قرآن اکیڈمی یسین آباد کراچی

میں رکھے۔ ایک دن میں ہی انسان اسلام سے پھر جائے گا دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ اس کی وجہ کیا ہوگی؟ دنیا کے بدلے میں اپنے دین کا سودا کر لے گا۔ یہ مت سمجھیں کہ دنیا سے مراد صرف مال ہے بلکہ اس میں دنیا کی ہر چیز شامل ہے چاہے وہ مال کی صورت میں ہو یا عزت و جاہ کی شکل میں یا دنیاوی منصب یا عورت سمیت کسی بھی صورت میں ہو۔ دنیا کی ہر چیز دنیاوی متاع میں داخل ہوگی اور اسی کو اللہ تعالیٰ نے ساز و سامان سے تعبیر کیا ہے۔“ [شرح ریاض الصالحین]

اس روایت میں آنے والے دو رفتن سے خبردار کیا گیا ہے۔ چنانچہ اعمالِ صالحہ میں جلدی کرنی چاہیے کیونکہ یہی نجات کی وہ کنجی ہے جس کے سائے میں انسان اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ دنیاوی زندگی کی چمک دمک اور دولت کی ہوس انسان کو اپنے ایمان کا سودا کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے اور وہ اپنے ضمیر کا سودا کر بیٹھتا ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ نیلوکار لوگوں کی صحبت اختیار کی جائے اور ان گناہوں سے بچا جائے جو جہنم میں لے جانے والے ہوں۔ جب اُمت کا کثیر طبقہ ان مہلک منکرات سے ناواقف ہو اور گناہ کو گناہ ہی نہ سمجھا جائے تو اصلاح ناممکن ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ ایسے منکرات کا صحیح فہم حاصل کیا جائے اور ان سے بچنے کی حتی المقدور کوشش کی جائے۔

### مردوزن کا اختلاط

سب سے زیادہ عام اور مہلک گناہ جو معاشرے میں پھیل چکا ہے بلکہ اُسے گناہوں کی فہرست ہی سے نکال دیا گیا ہے وہ بد نظری، بد نگاہی ہے۔ اس کی اصل وجہ معاشرے میں پھیلا ہوا بے پردگی کا ماحول ہے جس کے باعث شرم و حیا اٹھ چکی ہے۔ جس قوم سے شرم و حیا رخصت ہو جائے وہ اللہ کے عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مختلف قسم کے عذابوں میں گھرے ہوئے ہیں۔

مردوزن کا اختلاط ایک زہریلا نشہ ہے جو اب ہمارے کلچر کا حصہ بن چکا ہے جبکہ اسلام نے اس پر سختی کے ساتھ پابندی عائد کی ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرے پر بہت برے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور انسان آہستہ آہستہ شرم و حیا کا دامن چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ وقت آجاتا ہے کہ جب برائی بری نہیں لگتی بلکہ اسے قبول کر لیا جاتا ہے۔ پھر جو اصلاح کی کوشش ماہنامہ میثاق (60) اکتوبر 2024ء

کر رہے ہوتے ہیں اُن کو دقیا نوس اور تنگ نظر کہہ کر اپنے غبار آلود نظریات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ماہرین نفسیات اس کی وجہ ہمارے معاشرے میں رائج مخلوط تعلیمی نظام کو قرار دیتے ہیں۔ بقول اکبر الہ آبادی :

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا  
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوچھی!

اس تعلیمی نظام کے تحت پنپنے والے ہمارے معصوم بچے مادر پدر آزادی کے خواہاں ہوتے جاتے ہیں۔ پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا، سوشل میڈیا نے تو گویا اُن کی غیرت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ ڈراموں میں عشق کی کہانیاں دکھائی جا رہی ہیں اور رجمی رشتوں کو پیروں تلے روندنا جا رہا ہے۔ ان نحوستوں نے بے حیائی کا وہ طوفان برپا کیا ہے کہ مرد تو کیا عورتوں کی نگاہوں میں بھی وہ شرم و حیا خام ہی نظر آتی ہے جو کبھی مشرقی عورت کے مزاج کا خاصہ ہوا کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ زنا اور ہم جنس پرستی جیسے سنگین جرائم کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ پھر اس دور میں جبکہ غیر شرعی رسوں کی وجہ سے نکاح اور شادی کرنا مشکل بن گیا ہے زنا عام ہو رہا ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں مادر پدر آزادی کے قائل ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ اس سیلاب بلاخیز اور بے راہ روی کے نتیجے میں اب صورت اس حد تک بگڑ چکی ہے کہ اچھے اچھے خاندانوں میں بھی کوئی شرم و حیا باقی نہیں رہی۔ اس کا اندازہ اُن کی پچیوں کے لباس کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ نیم عریاں لباس کو اب کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔

سوال یہ ہے کہ آخر ہم اپنے بچوں کو کیا بنانا چاہتے ہیں جو ان پر کوئی روک ٹوک نہیں کرتے؟ اس تعلیمی نظام نے ماں باپ کا تقدس پامال کر دیا ہے۔ بچے تو جب سدھرتے جب بڑوں کو کچھ احساس ہوتا، مگر افسوس کہ بڑوں نے بھی ان کے آزادی کے سفر میں ان کا ساتھ دینا شروع کر دیا ہے۔ دُنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے کی خاطر اپنے بچوں کو دین سے دور رکھا۔ جب دنیاوی عیش و عشرت ہی مطمح نظر بن گیا تو آخرت کا تذکرہ کہیں بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں:

((مَا ظَهَرَ فِي قَوْمِ الزَّيْنَاءِ وَالزَّيْبَاءِ إِلَّا اُخْلُوا بِأَنْفُسِهِمْ عَذَابَ اللَّهِ))

(مسند احمد: ۳۸۰۹)

”جس قوم میں زنا اور سود پھیل گیا انھوں نے یقیناً اللہ کا عذاب اپنے اوپر اتار لیا۔“

## سودی نظام معیشت

نہ صرف ہمارے بینک اکاؤنٹس سیونگ ہیں بلکہ کاروبار کے لیے قرضے اور گاڑی اور مکان کے لیے بینک سے بڑے بڑے ادھار پر سودی لین دین ہم بڑے ذوق شوق سے کرتے ہیں۔ ہمیں ذرہ برابر بھی کوئی خوف نہیں کہ یہ معاملہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اعلان جنگ ہے۔ قرآن کریم میں اس کی شدید مذمت کی گئی ہے اور کثیر تعداد میں احادیث مبارکہ اس عمل کے قبیح تر ہونے پر شاہد ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے سود کھانے والے کھلانے والے اس کی گواہی دینے والے اور اس کا معاملہ لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی۔ (ابن ماجہ: ۲۲۷۷)

افسوس کہ آج اس حوالے سے کوئی جانتا ہی نہیں۔ اس سودی نظام کے اندر ہم بری طرح جکڑے جا چکے ہیں۔ یہ وہی زمانہ ہے جس کی خبر جناب رسول کریم ﷺ نے بایں الفاظ دی ہے:

((لَيَأْتِيَنَّ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقَى مِنْهُمْ أَحَدٌ إِلَّا أَكَلَ الزَّيْبَاءَ، فَمَنْ لَمْ

يَأْكُلْ أَصَابَهُ مِنْ غُبَارِهِ)) (ابن ماجہ: ۲۲۷۸)

”ایک زمانہ ضرور آیا آئے گا کہ کوئی بھی سود سے نہ بچ سکے گا اور کوئی شخص سود خوری سے

بچ بھی گیا تو بھی سود کے دھوئیں اور غبار سے نہیں بچ سکے گا۔“

بچنا تو درکنار ہمارا المیہ تو یہ ہے کہ جو دینی جماعتیں سود کے خاتمے کے لیے آواز بلند کرتی ہیں ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ مادہ پرست ذہنیت کے افراد کا کہنا ہے کہ اب سود کے بغیر کام نہیں چلتا۔ گویا ہم اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے خلاف اعلان جنگ جاری رکھیں گے۔ جب تک یہ سودی معاملات چلتے رہیں گے، معیشت مستحکم نہیں ہو سکے گی۔ غریب آدمی دن بدن بدترین صورت حال سے دوچار ہوتا رہے گا۔ مہنگائی اور بے روزگاری بڑھتی چلی جائے گی۔ خودکشی اور اپنے بچوں کو ہلاک کر دینے جیسے دل سوز واقعات میں اضافہ ہوگا۔ ارباب اختیار کو چاہیے کہ ہوش کے ناخن لیں اور وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے پر دیانت داری سے عمل کر کے اس سودی نظام کو ختم کرنے کا عزم کریں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو طرح طرح کے عذابات ہم پر مسلط ہوتے چلے جائیں گے۔

یہ مہلک مرض آج تقریباً ہر خاص و عام کی مجلس کا حصہ بن چکا ہے۔ یہ برائی ہمارے معاشرے میں اس طرح رائج ہو چکی ہے کہ جہاں دو افراد جمع ہوئے، تیسرے فرد کا ذکر لازمی طور پر کریں گے۔ ہم یہ کام بطور مشغلہ کرتے ہیں جبکہ قرآن کریم میں جن معاشرتی برائیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں غیبت کے حوالے سے بڑے سخت الفاظ آئے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا ۗ أَيُّ حُبٍّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۗ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۷﴾﴾ (الحجرات)

”اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو، بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور کسی کی ٹوہ میں نہ لگو اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ اس سے تو خود تم نفرت کرتے ہو۔ اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا بہت مہربان ہے۔“

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں چند نکات تحریر کیے ہیں:

- (۱) کسی کے خلاف تحقیق کے بغیر بدگمانی دل میں جمالینا گناہ ہے۔
- (۲) کسی دوسرے کے عیب تلاش کرنے کے لیے اس کی ٹوہ اور جستجو میں لگنا بھی اس آیت کی رُو سے گناہ ہے۔ البتہ کوئی حاکم مجرموں کا پتہ لگانے کے لیے تفتیش کرے تو وہ اس میں داخل نہیں ہے۔

(۳) غیبت کی تعریف ایک حدیث میں خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ: تم اپنے بھائی کا تذکرہ اس طرح کرو جو اسے ناگوار ہو۔ ایک صحابی نے پوچھا: اگر اس میں واقعی وہ عیب ہو تو (کیا اس کا بیان کرنا بھی غیبت ہے)؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر اس میں واقعی وہ عیب ہو تب تو وہ غیبت ہے اور اگر نہ ہو تو بہتان ہے، یعنی وہ دوہرا گناہ ہے۔

اس تناظر میں ہم اپنا جائزہ لیں کہ کیا ہماری مجالس غیبت اور بدگمانیوں سے خالی ہوتی ہیں۔ ایک صاحب علم نے کہا کہ آج اگر ہم اپنی مجالس سے بدگمانی اور غیبت کو نکال دیں تو بخدا خاموش ہی رہا کریں گے۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت مبارکہ کے ذیل میں فرماتے ہیں:

”گمان کرنے سے بچنے کا حکم دیا گیا (کیونکہ گمان ایک دوسرے کو عیب لگانے کا سبب ہے) اس پر فتوح افعال صادر ہونے کا مدار ہے اور اسی سے خفیہ دشمن ظاہر ہوتا ہے۔ کہنے والا جب ان امور سے یقینی طور پر واقف ہوگا تو وہ اس بات پر بہت کم یقین کرے گا کہ کسی میں عیب ہے تاکہ اسے عیب لگائے، کیونکہ کبھی فعل بظاہر فتوح ہوتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا اس لیے کہ ممکن ہے کرنے والا اسے بھول کر رہا ہو یا دیکھنے والا غلطی پر ہو۔“ (تفسیر کبیر، الحجرات: ۱۲)

مذکورہ بالا مہلک منکرات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم گناہ کو گناہ سمجھیں اور اپنے موجودہ معاشی اور تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ یہ کام اگرچہ اہل اقتدار یا حاکم کا ہے لیکن ہم بھی بری الذمہ نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے حصے کا کام کرنا ہے۔ اپنے دائرہ میں رہتے ہوئے ان منکرات سے خود بھی بچنا ہے اور اپنے اہل و عیال کو بھی بچانا ہے۔ زنا اور عریانیات میں مبتلا سماج پر احادیث کے مطابق عذاب الہی اور امراض و آفات کا نزول ہو کر رہتا ہے۔ ان سے حفاظت کی تدبیر صرف یہ ہے کہ ملت کا ہر فرد پہلے خود عفت مآب بنے اور پھر اپنے گھر، خاندان اور سماج کو بے حیائی اور بے حجابی کی لعنت سے پاک کرنے کی مہم میں لگ جائے۔ اگر ہم صدق دل سے تائب ہو کر اس کے خاتمے کی جدوجہد میں لگ جائیں گے تو بروز قیامت اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے سامنے عرض کر سکیں گے: ”اے اللہ! ہم نے تو کوشش کی جو ہمارے اختیار میں تھی، معاشرے کو مکمل طور پر بدلنا ہمارے اختیار میں نہیں تھا“۔ دنیاوی زندگی چند روزہ ہے، جس کے بعد اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے سامنے حاضری لازمی ہے۔ ہماری عملی جدوجہد اگر خلوص پر مبنی ہوگی تب ہی آخری نجات ملے گی۔ رب العزت سے دعا ہے کہ ان منکرات سے مجھے اور آپ کو بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!



قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔



## مسئلہ فلسطین: ایک طائرانہ نظر

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

تاریخی پس منظر

فلسطین مغرب میں صحرائے سینا و بحیرہ روم اور مشرق میں نہر اردن کے درمیان میں ایک چھوٹا سا خطہ ہے جہاں قدیم ترین زمانے سے کنعانی یا اموری قوم رہتی آئی ہے۔ یہ تاجر اور کسان لوگ تھے۔ مصر سے آنے والے یہودیوں کی انہی سے لڑائی ہوئی تھی۔ یہودیوں نے ان کو ’فلسطینی‘ کہا اور اس کے معنی ’شرابی‘، ’کبابی‘ کے رکھ دیے۔ اس علاقے کے قدیم باشندوں کی غلطی یہودیوں کے نزدیک صرف یہ تھی کہ انہوں نے یہودیوں کے مصر سے نکلنے کے بعد ان کا استقبال ’پانی اور روٹی سے نہیں کیا‘ (تورات، تثنیہ ۲۳)۔ اس لیے وہ گردن زدنی کے مستحق ہوئے۔ یہودی تقریباً ۱۲۲۰ ق م میں حضرت یوشع (Jushua) کی قیادت میں صحرائے سینا سے نکلنے کے بعد فلسطین میں داخل ہوئے۔ تورات (سفر یوشع) کے مطابق انہوں نے انتہائی وحشت کے ساتھ فلسطینیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

کنعانی بیبوسی قبیلہ Jebusites بیت المقدس کے ارد گرد رہتا تھا۔ یہ لوگ ۱۲۰ سال تک یہودیوں کا مقابلہ کرتے رہے اور ۱۰۴۹ ق م میں صرف حضرت داؤد علیہ السلام اس علاقے پر قبضہ کر پائے۔ شاؤل ۱۰۲۰ ق م میں پہلا حاکم ہوا جس نے سب یہودیوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا۔ اس کے بعد حضرت داؤد آئے جن کا زمانہ ۱۰۰۰ سے ۹۶۱ ق م تک کا ہے۔ انہوں نے ۹۹۰ ق م میں فلسطینی قبائل پر قابو پایا اور دمشق کو خراج دینے پر مجبور کیا۔ صرف حضرت داؤد اور حضرت سلیمان (ﷺ) کے زمانے میں یہودیوں نے فلسطین کے ایک بڑے خطے پر حکومت کی۔ حضرت داؤد کے بعد حضرت سلیمان آئے جن کا زمانہ ۹۶۱ تا ۹۲۲ ق م کا ہے۔ انہوں نے بیت المقدس میں ایک یہودی معبد بنایا جو ’ہیکل‘ (Temple) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس کی ایک دیوار آج بھی موجود ہے۔ مسلمان اسے مسجد اقصیٰ کی ’مغربی دیوار‘

(الحائط الغربی) کہتے ہیں جبکہ یہودی اس کو ’دیوارِ گریہ‘ (Wailing Wall) کا نام دیتے ہیں۔ اس سلطنت کے تعلقات یمن تک سے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ۹۲۲ ق م میں وفات پاتے ہی ان کی سلطنت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ جنوب میں ’یہودا‘ اور شمال میں ’اسرائیل‘ نامی دو ملک وجود میں آئے جو آپس میں دو سو سال تک لڑتے رہے۔

حضرات داؤد اور سلیمان (ﷺ) نے تقریباً چالیس چالیس سال حکومت کی، اس کے بعد سب ختم ہو گیا۔ لڑائیوں وغیرہ کو چھوڑ دیا جائے تو فلسطین پر صرف ۷۰ سال پورے طور پر یہودی حکومت رہی۔ بہترین حالات میں بھی یہودیوں نے پورے فلسطین پر کبھی قبضہ نہیں کیا۔ مؤرخ بیلوک کے مطابق، ان کے دورِ عروج میں بھی اس مملکت کی لمبائی ۱۲۰ میل اور چوڑائی ۶۰ میل تھی (یعنی موجودہ غزہ سے ملتی جلتی)۔ انہوں نے زیادہ تر پہاڑی علاقوں پر قبضہ کیا جبکہ وادی کے علاقے فلسطینیوں کے پاس رہے۔

آشوریوں نے ۷۲۱ ق م میں پہلی بار ’اسرائیل‘ کو ختم کر کے یہودیوں کو مشرق کی طرف دھکیل دیا اور دوسرے لوگ ان کی آبادیوں میں بسا دیے۔ یوں ان کا تاریخ سے نام و نشان مٹ گیا۔ البتہ دوسری یہودی حکومت ’یہودا‘ بن گئی تھی، جس کا صدر مقام اور شلیم تھا۔ ۵۹۷ ق م میں بخت نصر (Nebuchadnezzar) نے اس حکومت کا بھی خاتمہ کر دیا اور اس کے بادشاہ یواقیم (Joaqim) سمیت دس ہزار یہودیوں کو یرغمال بنا کر بابل لے گیا۔ ان میں نبی حضرت حزقیال بھی شامل تھے۔ جلد ہی باقی ماندہ یہودیوں نے بغاوت کی، جس کی وجہ سے بخت نصر ۵۸۷ ق م میں دوبارہ فلسطین آیا، اور شلیم کی اینٹ سے اینٹ بجادی، مزید بہت سے یہودیوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا اور باقی ماندہ یہودیوں کو اس علاقے سے نکال دیا۔ یوں سلطنت ’اسرائیل‘ کے ختم ہونے کے ۱۳۰ سال بعد سلطنت ’یہودا‘ کا بھی مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا۔

۵۳۹ ق م میں یہودیوں کی بابل کی غلامی ختم ہونے پر واپسی ہوئی۔ ایران کے بادشاہ کورش دوم نے فلسطین کے علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد یہودیوں کو فلسطین میں دوبارہ بسنے کی اجازت دی۔ یوں ۵۱۵ ق م میں ہیکل سلیمانی (Second Temple) دوبارہ بنا۔

۶۳ ق م سے ۷۰ ق م تک فلسطین پر رومن قبضہ رہا۔ یہودیوں کی بغاوت کی وجہ سے ۷۰ ق م میں رومن جنرل ٹائٹس (Titus) فلسطین آیا اور پوری طرح اور شلیم اور ہیکل کو تباہ کر کے اس کی

جگہ ایک رومن شہر بنام ’ایلیا کاپیتولینا‘ بنا کر واپس گیا۔ یہودیوں کو وہاں سے پوری طرح سے جلا وطن کر دیا گیا۔

۲۷۳ء میں انباط (عربوں) نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔

۶۳۹ء (۱۵ھ) میں بیت المقدس حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہوا جب کہ وہاں عیسائیوں کی حکومت تھی۔ مسجد اقصیٰ کی جگہ اُس وقت کوڑا پڑا ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس جگہ کو اپنے ساتھیوں کی مدد سے صاف کیا اور وہاں نماز پڑھی۔ بعد میں اس جگہ پر ایک مسجد بنی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں ’العہد العمری‘ نامی وثیقہ لکھا گیا جس میں یہودیوں کا بیت المقدس میں داخل ہونا منع کیا گیا اور یہ وہاں کے عیسائیوں کی درخواست پر ہوا۔

۱۰۹۹ء سے ۱۳۶۹ء تک صلیبی جنگیں جاری رہیں جو فلسطین پر یورپی عیسائی قوموں کے قبضے کی کوشش تھی، کیونکہ ان کے خیال میں حضرت مسیح علیہ السلام کی جائے پیدائش کو غیر عیسائیوں کے قبضے میں نہیں رہنا چاہیے۔ کل ۹ صلیبی جنگیں ہوئیں۔ بالآخر اکتوبر ۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو صلیبیوں کے ۹۹ سالہ قبضے کے بعد واپس لیا اور یہودیوں کو دوبارہ بیت المقدس آنے کی اجازت دی۔ انہوں نے بیت المقدس کی حفاظت کے لیے مراکش سے جفاکش مسلمانوں کو بلا کر مسجد اقصیٰ کے پاس بسایا۔ ان کا محلہ ’حی المغاربة‘ ۱۹۶۷ء تک باقی تھا۔ جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے بیت المقدس پر قبضے کے بعد چھ گھنٹے کے نوٹس پر ان کو باہر کر دیا اور ان کے گھر مسمار کر کے ’دیوار گریہ‘ کے سامنے ایک بڑا میدان بنا دیا جہاں یہودی اب عبادت کرتے ہیں۔

یورپ میں مستقل برے سلوک اور ابھرتی ہوئی نئی قومیتوں کی وجہ سے وہاں کے یہودیوں میں ’یہودی وطن‘ کی بات شروع ہوئی، حالانکہ نہ ان کا اپنا کوئی ملک تھا اور نہ ہی کسی علاقے میں ان کی اکثریت تھی۔ آسٹریں صحافی ہرتزل (Herzl) نے صہیونی تحریک شروع کی۔ ۱۸۶۰ء میں یہودیوں نے فلسطین میں دوبارہ بسنا شروع کیا۔ اُس وقت فلسطین میں یہودیوں کی کل آبادی پانچ ہزار تھی۔ فرانس کے بارون ہرش (Baron Hirsh) نے اس کام کے لیے پیسے دیے۔ بعد میں برطانیہ کے لارڈ روتھ چائلڈ (Lord Rothchild) نے بھی اس مقصد کے لیے کافی پیسے دیے تاکہ یہودی فلسطین میں زمینیں خرید کر وہاں بسنا شروع کریں۔

ماہنامہ **میناق** (67) اکتوبر 2024ء

## اعلان بالفور

پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ نے ’اعلان بالفور‘ جاری کر کے فلسطین میں ’یہودی وطن‘ بنانے کا وعدہ کیا، جبکہ اسی وقت سائکس پیکو (Sykes Picot) معاہدے کے ذریعے فرانس کے ساتھ اس علاقے کو آپس میں بانٹنے اور شریف مکہ سے معاہدہ کر کے اس پورے علاقے میں ’عرب حکومت‘ قائم کرنے کا جھوٹا وعدہ کیا۔ جس وقت یہ وعدے کیے گئے، برطانیہ یا فرانس کا اس پورے علاقے کے کسی حصے پر قبضہ نہیں تھا۔

اکتوبر ۱۹۱۸ء میں فلسطین پر برطانوی قبضہ ہو گیا جس کے بعد اعلان بالفور پر عمل کرتے ہوئے فلسطین کو یہودی ہجرت کے لیے کھول دیا گیا۔ ساٹھ سال سے مسلسل ہجرت کے باوجود اُس وقت تک فلسطین میں یہودیوں کی تعداد صرف ۵۶۰۰۰ تھی۔

برطانیہ نے فلسطین میں یہودیوں کو ہر سہولت کے ساتھ نیم فوجی دہشت گرد مسلح تنظیم ہاگانا (Haganah) بنانے کی اجازت دی۔ اس کی وجہ سے عملاً فلسطین میں ایک مسلح یہودی فوج تیار ہوئی، جبکہ عربوں کے اسلحے چھپنے گئے اور یہودیوں کے برعکس عربوں کے اسلحہ رکھنے پر جیل اور جلا وطنی کی سزا مقرر ہوئی۔ اس کے علاوہ متعدد یہودی دہشت گرد تنظیموں کا قیام عمل میں آیا، مثلاً ’ارگون‘، ’شترن‘، ’لمبی اور اتزیل‘ جنہوں نے ۱۹۴۸ء میں عربوں کو اپنے وطن سے بندوق کے ذریعے کھد بڑنے کا کام کیا۔ ان تنظیموں کو بعد میں اسرائیلی فوج میں ضم کر دیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اسے فلسطین سے بھاگنے پر مجبور کرنے کے لیے اب یہودی دہشت گردوں نے انگریز فوج اور انتظامیہ پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ فلسطین میں یہودی دہشت گردی کا سامنا کرنا کمزور برطانیہ کے بس میں نہیں تھا، اس لیے اس نے فلسطین کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے اقوام متحدہ کے سامنے پیش کر دیا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو فلسطین کو یہودی اور عرب ریاستوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ عرب اکثریت کو ۴۴ فیصد اور یہودی اقلیت کو ۵۶ فیصد دیا گیا۔ عربوں نے اس ظالمانہ فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ یہودیوں نے مارچ ۱۹۴۸ء سے ’آپریشن دلایت‘ کے تحت فلسطین میں اسرائیل بنانے کے لیے عربوں پر حملے اور قتل عام شروع کر دیے تاکہ وہ یہودی سلطنت سے بھاگ جائیں۔ اس کے ردعمل کے طور پر عرب ممالک (مصر، اردن اور عراق ماہنامہ **میناق** (68) اکتوبر 2024ء

وغیرہ) نے فلسطین میں اپنی فوجیں بھیجیں جن کو واضح حکم تھا کہ تقسیم پلان کے تحت یہودیوں کو دیے گئے حصے پر قبضہ نہ کریں۔ یوں عرب فوجیں آگے نہیں بڑھیں؛ جبکہ یہودی دہشت گرد تنظیمیں حملے کر کے عربوں کو قتل اور مختلف علاقوں سے نکالتی رہیں۔ فلسطین کے ۷۰ فیصد عرب اپنے علاقوں سے بھاگ کر قریبی علاقوں اور ملکوں میں پناہ گزیں ہو گئے، اور پھر اقوام متحدہ کی بیسیوں قراردادوں کے باوجود آج تک اپنے گھروں کو واپس نہ جاسکے۔

## اسرائیل کا قیام

۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو یہودیوں نے اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا اور فلسطین میں خانہ جنگی چھڑ گئی۔ امریکا اور روس نے چند گھنٹوں کے اندر اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ ۱۹۴۹ء میں جنگ بندی تک فلسطین میں ۷۸ فیصد زمینوں پر یہودی قابض ہو گئے، یعنی فلسطینی عربوں کے لیے ان کے ملک کا صرف ۲۲ فیصد حصہ بچا۔ اس باقی ماندہ فلسطین کے ایک حصے (مغربی کنارہ بشمول بیت المقدس) پر اردن نے اور دوسرے حصے (غزہ) پر مصر نے قبضہ کر لیا۔

۵ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے حملہ کر کے باقی ماندہ ۲۲ فیصد فلسطین کے ساتھ مصر کے صحرائے سینا اور شام کی جولان پہاڑیوں (Golan Heights) پر بھی قبضہ کر لیا۔

## ”کیمپ ڈیوڈ“ اور ”اوسلو“ معاہدے

اکتوبر ۱۹۷۳ء میں مصر اور شام نے اپنے علاقے آزاد کرانے کے لیے جنگ کی۔ مصر نے صحرائے سینا کا ایک تہائی علاقہ واپس لیا جبکہ شام ناکام رہا۔ اس کے بعد ۱۹۷۹ء میں مصری صدر سادات نے اسرائیل کے ساتھ ”کیمپ ڈیوڈ معاہدہ“ کر کے صلح کر لی، جس کی وجہ سے اسرائیل پر دباؤ بہت کم ہو گیا اور دوسرے عرب وغیر عرب ممالک نے اسرائیل کے ساتھ تعلقات قائم کرنے شروع کر دیے۔ اس سے پہلے دنیا کے اکثر ممالک (بشمول بھارت) اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

باقی ماندہ فلسطین پر مسلسل اسرائیلی قبضے کے خلاف فلسطینیوں کا پہلا انتفاضہ دسمبر ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۱ء کی میڈرڈ کانفرنس تک چلا۔ تھک ہار کر بالآخر فلسطینی قیادت نے ۱۹۹۲ء میں اسرائیل کے ساتھ ”اوسلو معاہدہ“ کیا جس کی رو سے پانچ سال میں خود مختار فلسطینی ریاست قائم ہونا قرار پایا، جبکہ فلسطین کے بنیادی مسائل (بیت المقدس / پناہ گزین / سرحد / داخلی وسائل) کو بعد کے ماہنامہ **میناق** (69) اکتوبر 2024ء

لیے چھوڑ دیا گیا۔ پانچ سال کے اندر فلسطینی ریاست وجود میں آئی تھی لیکن تیس سال کے بعد بھی آج تک وجود میں نہیں آئی ہے۔ فلسطینی اتھارٹی (فلسطینی مقتدرہ) کے نام پر جو علاقہ موجود ہے اس کی حیثیت صرف ایک میونسپلٹی کی ہے۔ وہ اسرائیل کے منبر کے طور پر کام کرتی ہے، یعنی اس کے خلاف مزاحمت کرنے والے فلسطینیوں کے بارے میں اسرائیل کو باخبر کرتی ہے اور اسی وجہ سے وہ فلسطینی عوام میں مقبول نہیں ہے۔

اوسلو معاہدہ کرنے والے اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق رابین کو یہودی شدت پسندوں نے ۴ نومبر ۱۹۹۵ء کو قتل کر دیا۔ اسرائیل میں فلسطینیوں سے کسی بھی سمجھوتے کی مخالف لیکوڈ پارٹی نے امریکی نیوکون کی مدد سے کلین بریک (Clean Break) نامی پلان بنوایا تاکہ اوسلو معاہدے کو عملاً کالعدم کیا جاسکے۔ ۱۹۹۷ء میں لیکوڈ کے برسر اقتدار آتے ہی اس پلان پر عمل شروع ہو گیا اور دھیرے دھیرے فلسطینی مقتدرہ کو بے اختیار بنانے کے عمل کا آغاز ہو گیا؛ جبکہ فلسطینی حکومت کو دیے جانے والے علاقوں میں یہودی نوآباد بستیاں بنانے کا کام تیزی سے شروع ہو گیا۔ سارا الزام عربوں پر رکھا گیا جبکہ درحقیقت معاہدے کو ناکام اسرائیل نے بنایا۔ اس کے نتیجے میں ۲۰۰۰ء میں دوسرا انتفاضہ شروع ہوا جو پانچ سال چلا۔

مئی ۲۰۱۲ء میں یوسی بیلین (Yossi Beilin) نے جو اسرائیل کی جانب سے اوسلو معاہدہ کا آرکائیو تھا، فلسطین اتھارٹی کو مشورہ دیا کہ اتھارٹی کو تحلیل کر دو تاکہ دنیا کے سامنے اسرائیل کا اصل چہرہ سامنے آجائے۔ یہودی نوآبادیاں فلسطینی عربوں کی ان زمینوں پر مستقل قائم ہو رہی ہیں جنہیں اسرائیل بھی مانتا ہے کہ انہیں فلسطینیوں کو واپس کرنا ہے۔

## حماس کی مزاحمت

اگست۔ ستمبر ۲۰۰۵ء میں حماس کی مزاحمت کی وجہ سے اسرائیل غزہ سے نکل گیا لیکن علاقے پر بری، بحری اور فضائی کنٹرول قائم رکھا۔ جنوری ۲۰۰۶ء میں حماس کی منتخب حکومت کو اسرائیل، امریکہ اور یورپ وغیرہ نے مل کر چند مہینوں کے اندر توڑ دیا اور ۲۰۰۷ء سے اسرائیل نے غزہ کا مکمل محاصرہ شروع کر دیا جو اب تک جاری ہے۔

غزہ پر اسرائیلی حملے ۲۰۰۶ء، ۲۰۰۸ء، ۲۰۰۹ء، ۲۰۱۰ء، ۲۰۱۱ء، ۲۰۱۲ء میں ہوئے۔ ۲۰۱۴ء میں رمضان المبارک کے دوران اسرائیل نے حملہ کر کے غزہ کو شدید نقصان پہنچایا لیکن ماہنامہ **میناق** (70) اکتوبر 2024ء

مزاحمت کو شکست نہ دے سکا۔ حماس نے اس جنگ کا ۵۱ دن تک مقابلہ کیا اور دنیا کی پانچویں طاقتور فوج کو جنگ بندی پر مجبور کر کے بڑی حد تک اپنے مطالبات منوالیے۔ اسرائیل اپنے مطالبات (راکٹ حملے بند کرانا، غزہ کو اسلحے سے خالی کرانا اور سرنگوں کا خاتمہ) قبول کرانے میں ناکام رہا۔

۲۰۱۸ء میں غزہ کے لوگوں نے محاصرے کے خلاف سرحد پر احتجاج شروع کیا۔ اسرائیل نے فائرنگ کر کے سات فلسطینیوں کو قتل کر دیا۔

مارچ ۲۰۱۹ء میں اسرائیل نے غزہ پر پھر حملہ کیا۔ اس کے بعد مئی ۲۰۱۹ء نومبر ۲۰۱۹ء، ۲۰۲۱ء، ۲۰۲۲ء اور مئی ۲۰۲۳ء میں بھی غزہ پر اسرائیلی حملے ہوئے۔ مئی ۲۰۲۱ء میں اسرائیلی حملہ پہلے کی طرح نہ صرف ناکام رہا بلکہ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حماس اور الجہاد الاسلامی اسرائیل کے ساتھ فوجی برابری (deterrence) کی حد تک پہنچ چکے ہیں۔ اس جنگ میں پہلی دفعہ اسرائیل کا بہت جانی و مالی نقصان ہوا۔ فلسطینیوں نے اسرائیل کے اندر انتقامی کارروائی کی اور اسے ایک طرفہ جنگ بندی پر مجبور کر دیا۔ اس جنگ کے دوران ۲۴۲ فلسطینی شہید ہوئے، غزہ کے ۸۰,۰۰۰ لوگ بے گھر ہوئے اور ۷,۰۰۰ رہائشی اور تجارتی پوٹس تباہ ہوئے۔

## غزہ کی حالیہ جنگ

۱۷ اکتوبر ۲۰۲۳ء کو حماس نے اسرائیل پر اچانک بڑا حملہ کیا جو اس کے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ یہ حملہ ۱۹۶۷ء کے اسرائیلی قبضے اور ۲۰۰۶ء سے جاری اسرائیلی محاصرے کے خلاف تھا۔ یہ حملہ ہر طرح سے بین الاقوامی قانون کے تحت مقبوضہ علاقوں کے باشندوں کے حق مزاحمت کا استعمال تھا۔ اس کے جواب میں اسرائیل نے غزہ کو پوری طرح تباہ کرنا شروع کر دیا۔ جنگ اب اپنے دوسرے سال میں داخل ہو رہی ہے۔ انسانی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی کہ ایک مختصر اور نہتی آبادی دنیا کی پانچویں بڑی فوجی طاقت کے خلاف اتنے لمبے عرصے تک اتنی بہادری سے لڑتی رہے۔ اس سے پہلے عرب فوجوں کی اسرائیل سے لڑائی صرف چند دن چلتی تھی۔ اس جنگ میں اسرائیل نے بے دریغ بمباری کی ہے۔ غزہ کے تقریباً ۹۰ فیصد گھر اور بلڈنگیں اس اندھا دھند بمباری سے منہدم ہو چکے ہیں۔ پانی، بجلی، سیور لائن اور ٹیلیفون و انٹرنیٹ کی لائنیں پوری طرح تباہ ہو چکی ہیں۔ یہ بمباری دنیا بھر میں پچھلے ایک سو سال کے دوران کی گئی

شدید ترین بمباری ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں بھی کسی علاقے پر اتنی شدید بمباری نہیں ہوئی تھی۔

اسرائیل اور امریکہ کا پلان تھا کہ شدید بمباری اور کھانے پینے کی اشیاء کو بالکل روکنے سے غزہ کے لوگ مصر کے صحرائے سینا کی طرف بھاگ جائیں گے اور یوں غزہ کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا، لیکن غزہ کے لوگوں نے اس سازش کو ناکام بنا دیا۔

غزہ میں مکمل اسرائیلی محاصرے کی وجہ سے کھانے پینے کی چیزوں اور دواؤں کی شدید قلت ہے جس کی وجہ سے وہاں سینکڑوں لوگ خاص طور سے بچے بھوک پیاس سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ تمام اسپتال تقریباً تباہ ہو چکے ہیں۔ اسرائیل نے غزہ کے لوگوں کو اپنے علاقوں سے نکل کر صحرائے سینا سے ملے ہوئے غزہ کے جنوب مغربی شہر رفح میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے لیکن وہ وہاں بھی اسرائیلی حملوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ موجودہ جنگ سے پہلے غزہ میں روزانہ ۵۰۰ ٹرک کھانے اور ادویات وغیرہ کے داخل ہوتے تھے اب وہاں صورت حال نہایت ابتر ہے۔ اسرائیلی حملوں میں سینکڑوں صحافی قتل ہو چکے ہیں جن میں زیادہ تر فلسطینی ہیں۔

## عالمی ردِ عمل

جنوبی افریقہ نے ہیگ میں واقع بین الاقوامی عدالت میں اسرائیل کے خلاف مقدمہ دائر کیا کہ وہ غزہ میں نسل کشی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ بین الاقوامی عدالت نے اسرائیل کی سرزنش کی اور اس کو نسل کشی روکنے کو کہا لیکن اس کا اسرائیل پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے، کیونکہ اس کو امریکہ اور مغربی ممالک خصوصاً جرمنی اور برطانیہ کی پوری پشت پناہی حاصل ہے۔ اسی جنگ کے دوران اسرائیل کو بچانے کے لیے امریکہ متعدد بار اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل میں جنگ بندی کی قرارداد کے خلاف ویٹو استعمال کر چکا ہے۔ نیز جنگ کے دوران اسرائیل کی بھرپور جنگی اور مالی مدد کر رہا ہے۔ جنگ کے شروع ہوتے ہی امریکہ نے اپنے دو بحری بیڑے علاقے میں بھیج دیے تاکہ کوئی ملک اسرائیل کے خلاف جنگ میں شامل نہ ہو سکے۔

نسل کشی کے مقدمے کے علاوہ دنیا کے ۵۲ ممالک نے بین الاقوامی عدالت میں اسرائیل کے خلاف ایک اور مقدمہ دائر کیا کہ غزہ، مغربی پٹی اور بیت المقدس پر ۱۹۶۷ء سے جاری اسرائیلی قبضہ ہٹایا جائے۔ افسوس ہے کہ مقدمہ زیادہ تر غیر عرب اور غیر مسلم ملکوں نے دائر

## قیامِ پاکستان کی بنیاد اور ہماری ذمہ داریاں

### ایک تصحیح — ایک وضاحت

”میثاق“ کے شمارہ اگست ۲۰۲۳ء میں جناب ممتاز ہاشمی کے مضمون ”قیامِ پاکستان کی بنیاد اور ہماری ذمہ داریاں“ میں غلطی سے سورۃ الانفال کی آیت ۲۶ کی بجائے آیت ۲۷ کا متن درج ہو گیا تھا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس کوتاہی سے درگزر فرمائے۔ متعلقہ آیت مع ترجمہ درج ذیل ہے:

﴿وَأَذِّنْ لِلْعَذَابِ إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَعْصِفُونَ فِي الْأَرْضِ تُخَافُونَ أَنْ يَتَّخِظَكُمْ النَّاسُ فَأَوْنَكُمْ وَأَيُّكُمْ يَنْصُرُهُمْ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٢٦﴾﴾

(الانفال)

”اور اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم زمین میں قلیل تھے کمزور شمار کیے جاتے تھے اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ تم کو لوگ کوچ کھسوت نہ لیں، سو اللہ نے تم کو رہنے کی جگہ دی اور تم کو اپنی نصرت سے قوت دی اور تم کو بہترین پاکیزہ رزق عطا فرمایا تاکہ تم شکر کرو۔“



اسی مضمون کے بارے میں ہمیں ممتاز مؤلف جناب رضی الدین سید کا مکتوب موصول ہوا ہے جس میں موصوف نے علامہ محمد اسد کی شخصیت کے بارے میں مزید روشنی ڈالی ہے۔ قارئین کے استفادہ کی خاطر یہ مکتوب ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

مدیر محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میثاق شمارہ اگست میں شائع شدہ مضمون ”قیامِ پاکستان اور ہماری بنیادی ذمہ داریاں“ از جناب ممتاز ہاشمی میں علامہ محمد اسد کی شخصیت اور پاکستان سے متعلق ان کی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مواد کو مزید موثر کرنے کی خاطر رقم ذیل میں چند نکات کا مزید اضافہ کرنا چاہتا ہے تاکہ ان کی شخصیت اور اُس وقت تک کے قومی حالات بہتر طور پر قارئین کے سامنے آسکیں۔

کیا۔ غزہ کی جارحیت کی وجہ سے متعدد غیر مسلم ملکوں نے اسرائیل سے سفارتی تعلقات توڑ لیے ہیں لیکن کسی عرب یا مسلم ملک کو یہ توفیق نہیں ہوئی، بلکہ کچھ تو در پردہ اسرائیل کی مدد کر رہے ہیں۔ اس جنگ کے دوران حزب اللہ اور لبنان کی الجماعۃ الاسلامیۃ نے شمالی اسرائیل پر حملے کیے ہیں۔ عراق کی کچھ ملیشیا نے بھی اسرائیلی اور امریکی ٹھکانوں پر حملے کیے ہیں۔ یمن کی انصار اللہ حکومت نے باب المندب اور بحر احمر سے اسرائیلی بحری جہازوں یا اسرائیل سامان لے جانے والے بحری جہازوں پر پابندی لگادی ہے اور اس طرح کے کچھ بحری جہازوں پر حملہ بھی کیا ہے۔ اسی وجہ سے یمن پر امریکہ اور برطانیہ مستقل حملے کر رہے ہیں۔

سارے نقصانات کے باوجود موجودہ جنگ نے اسرائیل کے خلاف پاسا الٹ دیا ہے۔ اسرائیل کے فوجی تقویٰ کا دعویٰ اور اس کی بنیاد پر عربوں کا بلیک میل اب قضیہ پارینہ بن چکا ہے۔ سفارتی طور پر اسرائیل کو ہر جگہ منہ کی کھانی پڑ رہی ہے۔ عرب ممالک سے اسرائیل کے تعلقات کی گاڑی رک چکی ہے۔ فلسطین کا مسئلہ اب دوبارہ عرب اور مشرق وسطیٰ کی سیاست کا اولین مسئلہ بن چکا ہے۔ حماس اور فلسطینی مزاحمت کو اب کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ غزہ اور حماس نے اسلامی تاریخ میں ایک سنہری باب کا اضافہ کیا ہے، جو عین جالوت اور حطین کی طرح صدیوں یاد رکھا جائے گا۔

قرآن کریم میں سورۃ الاسراء کی آیات ۸ تا ۱۲ میں بتایا گیا ہے کہ بیت المقدس میں یہودی تین بار سرکشی کریں گے اور تینوں بار اللہ پاک ان کو سخت سزا دیں گے۔ اب تک دوبارہ ہو چکا ہے (۵۸۷ قبل مسیح اور ۷۰ عیسوی) جبکہ ایک سرکشی ابھی باقی ہے۔ اس سرکشی پر بھی ان کی پہلے کی طرح سرکوبی کی جائے گی۔ شاید اس کا وقت آ گیا ہے۔ آج پہلی بار دنیا بالخصوص ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے اکثر ممالک اسرائیل کے خلاف ہیں۔ مغربی ممالک کے بہت سے باشندے اسرائیل کے خلاف کھڑے ہیں اور اپنی حکومتوں کے خلاف مظاہرے کر رہے ہیں۔ اپنی تاریخ میں آج پہلی دفعہ اسرائیل اکیلا کھڑا ہے۔ اس کے جھوٹوں کا گھڑا پھوٹ چکا ہے۔

(تشیکر: ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ انڈیا۔ اپریل ۲۰۲۳ء)



یہ اضافہ جات راقم نے علامہ اسد کی اپنی کتاب "The Road to Makkah" سے بیشتر انہی کی زبانی پیش کیے ہیں۔ علامہ محمد اسد لکھتے ہیں:

”۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد مجھے ”محکمہ اسلامی تعمیر نو“ (Department of Islamic Reconstruction) کا سربراہ مقرر کیا گیا تاکہ ملک کے لیے ایک عملی اسلامی نظام سامنے لایا جاسکے۔

..... لیکن دو سال کی لگاتار محنت شاقہ (وفات قائد اعظم از مؤلف) کے بعد حکومت پاکستان کی جانب سے میرا تبادلہ وزارت خارجہ میں کر دیا گیا جہاں سے مجھے نیویارک میں واقع اقوام متحدہ کے آفس میں کامل اختیارات کے ساتھ بطور سفیر تعینات کر دیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک طرف میں مغربی ممالک سے پاکستان کے تعلقات کو مضبوط بناؤں اور دوسری جانب مسلم مملکتوں سے بھی روابط مضبوط کروں۔“ (واضح رہے کہ اس وقت وزیر اعظم لیاقت علی خان تھے: مؤلف)

”یو این او کے مغربی سفیروں کو اگرچہ اسلام سے متعلق دیگر پاکستانی مسلم سفراء بھی واقفیت دے سکتے تھے لیکن ایک مغربی مسلم فرد ہونے کے باعث جس تفصیلی اور مدلل انداز سے میں انہیں اسلام کے بارے میں سمجھا سکتا تھا وہ دوسرے پاکستانی کہاں کر سکتے تھے!..... (اُس دور میں) ملک میں کتنے لوگ آخر اس صلاحیت کے حامل تھے جو مغربی نمائندوں کو اس بہتر انداز سے دین اسلام کے بارے میں کما حقہ واقف کروا سکتے جس انداز سے اسلام قبول کردہ خود میں مغربی فرد انہی کی زبان میں کروا سکتا تھا؟ میری وضاحتیں بہتر انگریزی اور مناسب سفارتی زبان دونوں انداز میں ان پر یقیناً ایک عمدہ اثر چھوڑتی تھیں..... میں جب بھی ان کے سامنے اسلام کی صفات سفارتی مثالوں کے ساتھ پیش کرتا تو وہ حیران رہ جاتے تھے۔ تمام مندوب تب گمان کرتے تھے کہ اقوام متحدہ میں پاکستان نے انہیں گویا خاص اسی مقصد کے لیے متعین کیا ہے.....“

”۱۹۵۲ء کے بعد میں نے یو این مشن اور وزارت خارجہ دونوں ہی سے استعفادے دیا اور مذکورہ کتاب The Road to Makkah لکھنے کے قصد میں ڈوب گیا۔“

(کتاب مذکورہ صفحات بالترتیب ۸۰، ۲۱، ۸۰، ۲۱ شائع شدہ نیویارک ۱۹۵۴ء)

ان کے بارے میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ قیام پاکستان سے قبل بھارت میں رہ کر انہوں

نے اپنے انگریزی رسالے میں ”ہم پاکستان کیوں بنانا چاہتے ہیں؟“ کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ بھی شذوذ سے شروع کیا تھا، جس کا لُب لُب اب یہی تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے یہ ملک ایک عملی تجربہ گاہ ثابت ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

”میں ۱۹۲۶ء میں مسلمان ہوا تھا، جس کے بعد میری ملاقات لاہور میں فلسفی، شاعر اور پاکستان کے روحانی باپ علامہ اقبال سے ہوئی۔ چنانچہ یہ علامہ اقبال ہی تھے جنہوں نے مجھے ہندوستان سے مزید آگے چین، مشرقی ترکستان اور انڈونیشیا وغیرہ کی جانب سفر سے منع کرتے ہوئے صرف ہندوستان ہی میں مقیم رہنے پر زور دیا تھا۔

..... اگرچہ تخلیق پاکستان اُس وقت تک محض ایک خواب تھا لیکن علامہ نے مجھے مستقبل کی اسلامی ریاست ہی میں رہ کر دانشورانہ رہنمائی کی ہدایت کی تھی..... چنانچہ انہی کے ایما پر میں نے ہندوستان میں اپنے کئی سال مطالعہ کرنے، لکھنے اور تقریریں کرنے میں گزارے۔ حتیٰ کہ تب لوگ مجھے اس موضوع پر ایک اہم شخصیت گرداننے لگے تھے۔“ (کتاب مذکورہ، صفحہ ۲)

واضح رہے کہ علامہ محمد اسد بنیادی طور پر آسٹریا کے یہودی تھے جو اپنے ملک کے ایک قومی اخبار سے منسلک تھے۔ ان کا اصل یہودی نام Leopold تھا۔ Leo کے معنی چونکہ اسد (شیر) کے ہوتے ہیں اُس لیے قبول اسلام کے بعد ان کا نام محمد اسد ہی رکھ دیا گیا تھا۔

رضی الدین سید، کراچی



## ماہنامہ ”میثاق“ لاہور

داعی قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے قرآنی فکر کا ترجمان، ایک علمی، دعوتی اور تربیتی رسالہ!

صرف آپ ہی کے زیر مطالعہ کیوں؟

وقت اور حالات کی اشد ضرورت ہے کہ اسے ایک مشن سمجھ کر واعظین و مرتبین، تعلیمی اداروں، لائبریریوں، مکتبہ جات اور ہر گھر و فرد اور خاص طور پر الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر اپنے دوست احباب اور اعزہ و اقرباء تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

یہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا!

## کیا ابتدائی دور کا انسان جنگلی تھا؟

رضی الدین سید ☆

لادینی دانشوروں نے یہ بات زور شور سے پھیلائی ہے کہ ابتدائی انسان اپنے جسم ڈھانپنے کے لیے پتے استعمال کرتے تھے اور جنگلوں میں ٹھکانا بناتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اولین انسان حضرت آدم علیہ السلام زمین پر آنے سے پہلے جنت کی نعمتوں بھری دنیا میں رہا کرتے تھے۔ انہیں حریر و ریشم کے لباس اور سونے کے تاج پہنائے گئے ہوں گے اور کھانے کے لیے ہمہ قسم کے پھل اور پرندوں کے گوشت دیے جاتے رہے ہوں گے۔ قرآن حکیم میں جنت کی بعض نعمتوں کا ذکر باریں الفاظ ہوا ہے:

﴿وَقَا كِهَاتِهٖ مِمَّا يَتَخَيَّرُونَ ۝۲۰ وَكَلِمَةً طَيِّبَةً مِّمَّا يَشْتَهُونَ ۝۲۱﴾ (الواقعة)

”اور پھل جو وہ پسند کریں اور پرندوں کے گوشت جو انہیں مرغوب ہوں۔“

انہیں اگر اللہ تعالیٰ اپنا خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجے گا تو کیا کھانے کو کچا گوشت، تن ڈھانپنے کو پتے اور رہنے کو جنگل فراہم کرے گا؟ اتنی بڑی ذمہ داری ان حالات کے ساتھ عطا کرے گا؟ کیا اس حوالے سے اللہ تعالیٰ بے فکر تھا؟ پھر تو وہ بہت ناانصاف ہوا کہ اپنے ہی مہجور دہلیز بندے کے ساتھ ایسا ظلم عظیم کیا! حضرت آدم اور اماں حوا دونوں بے چارے بارش، سردی اور گرمی میں جنگلوں، غاروں، درختوں پر رہتے تھے۔ موسمی حالات سے بچاؤ کے لیے موٹی کھال استعمال کرتے تھے، اور کچا گوشت کھاتے تھے۔ عام عقل میں یہ بات بھلا کہاں سماتی ہے؟ کیا کوئی انسان کبھی کچا گوشت بھی کھا سکتا ہے؟ یہ نہ تو اس کی فطرت میں ہے اور نہ اس کا جسم ہی اس انداز کا تشکیل دیا گیا ہے، خواہ وہ دنیا کا سب سے پہلا انسان ہی کیوں نہ ہو۔ بس ایک سبق ہے جو آج تک مسلسل رٹایا جا رہا ہے۔

☆ ای میل: national.a.research@gmail.com

حضرت نوح علیہ السلام، جنہیں آدم ثانی کہا جاتا ہے، قرآن بتاتا ہے کہ ان کا گھرا تباہ تھا کہ تمام پیروکار تیس یا چالیس جو کچھ بھی ہوں، اسی گھر میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ ﴿وَلَمَنْ دَخَلَ بُيُوتَهُمْ مُؤْمِنًا وَوَلَّيْتُمْ مَنِائِنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ﴾ (نوح: ۲۸)۔ حضرت نوح علیہ السلام کا دور آج سے لگ بھگ ۶۰۰۰ سال قبل کا تو ضرور ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس وقت تک انسان نے کافی ترقی کر لی تھی۔ یہ سب محض افسانے ہیں جو دہریوں اور خدا بیزار لوگوں نے ہم سب کے ذہن میں پیوستہ کر دیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفت تو یہ ہے کہ نیک و صالح بندوں کو وہ اپنی خاص الخاص حفاظت اور نعمتوں میں رکھتا ہے۔ آدم علیہ السلام تو بڑے مرتبے والے پیغمبر تھے۔ ایک اجنبی دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ انہیں اپنی وحی متواتر کے ذریعے بہت کچھ ہدایات بھی دیتا ہوگا، جو ان تک حضرت جبریل علیہ السلام ہی لاتے ہوں گے۔ جب اللہ تعالیٰ انہیں درخت کا پھل چکھنے کے بعد کا گناہ معاف کروانے کے لیے کلمات سکھا سکتا ہے تو اس نے انہیں کھانے پینے اور مکان بنانے کی تراکیب کیوں نہیں القا کی ہوں گی؟ یہ بات خلاف عقل ہے کہ اس لبق و دق دنیا میں اللہ تعالیٰ اپنے خلیفہ خاص کو اتارے اور پھر ہدایت کے لیے فرشتے کو ایک بار بھی ان کے پاس نہ بھیجے!

لادین مفکرین یہ حقیقت جان بوجھ کر بھلا دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب آسمان سے سب سے پہلے انسان کو اتارا تھا تو وہ محض مٹی کی ایک بے جان صورت نہیں تھا بلکہ ایک متحرک جسم و جان رکھتا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پیر بھی مضبوط تھے اور وہ مشقت بھی خوب کر سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ عقل سلیم کا بھی مالک تھا۔ بے شک اُس دور کا انسان آج کے دور کی مانند سائنسی دماغ نہ رکھتا ہو گا لیکن ہر طرح کا فرق ملحوظ خاطر رکھنے کے باوجود وہ عقل سے بالکل عاری ہرگز نہ تھا۔ اسی باعث اسے جانور نہیں بلکہ انسان کہا گیا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ اگر انسان کے پاس عقل ہوگی تو وہ اسے استعمال بھی کرے گا، کیوں کہ عقل کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے اظہار کے لیے بے چین رہتی ہے۔ سو اگر اس پہلے انسان کے پاس عقل ہوگی تو اپنے رہن سہن کی خاطر وہ سوچ بچار بھی کرے گا، نت نئے راستے بھی کھولے گا، اور کوئی نیا راستہ بھی دریافت کرے گا۔

کسی چٹیل میدان میں ایک کچا سامکان بنانے کے لیے آخر کون سی انجینئرنگ کی ڈگری درکار ہوتی ہے؟ گارے، روڑے اور پتھر کی چار دیواری، اوپر گھاس پھوس اور کھجیوں کی ایک

چھت ہی تو ڈالنی ہوتی ہے۔ یوں ایک گھر تیار ہو جاتا ہے۔ تھر کے علاقے میں چٹائیوں، سرکنڈوں، لکڑیوں اور گھاس پھوس سے بنی ہوئی مخصوص جھگیاں آج بھی بے شمار ملتی ہیں جہاں کے دیہاتی صدیوں سے آرام و سکون کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ بھلا کوئی سوچے کہ عقل رکھنے کے باوجود قدیم دور کا انسان آخر کیوں غاروں، بھٹوں اور جنگلوں میں جانوروں کی مانند رہائش رکھتا ہوگا! اللہ تعالیٰ نے آسمان سے کیا، عقل و خرد سے بالکل آزاد، جنگلی، وحشی اور احق انسان بھیجے تھے؟ معاذ اللہ! چلائی تو اسے تھی وسیع و عریض دنیا، کام اس نے انسان کو دیا تھا کٹھن ترین مگر مال اتارا تھا اس نے حد درجہ تھر ڈکلاس؟ کون سی عقل بھلا اس مفروضے کو تسلیم کر سکتی ہے؟ دنیا میں کوئی ادارہ اگر کسی دوسرے شہر میں اپنی نمائندگی کے لیے کسی کو روانہ کرے گا تو وہ ایک قابل ترین فرد ہی کو بھیجے گا۔ یہ ایک بالکل فطری و عقلی بات ہے۔ عجیب بات ہے کہ دنیا چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ جب کسی کو یہاں بھیجے گا تو ڈھونڈ ڈھونڈ کے ردی و بے کار مال ہی اتارے گا! کیا وہ علیم و خبیر نہیں ہے؟

ایک اور صفت جس سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو بالکل اس کی ابتدا ہی میں نوازا تھا وہ اس کے زبانی اظہار کی صلاحیت تھی۔ انسان اپنے آغاز سے آج تک بولتا ہی رہا ہے اسی لیے اسے حیوانِ ناطق بھی کہا جاتا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے سورۃ الرحمن کے آغاز ہی میں بتایا ہے کہ ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾﴾ یعنی خدائے رحمن نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان کرنے کی صلاحیت دی۔ یہ آیت خاص نبی آخر الزمان ﷺ کے لیے نہیں اُتری بلکہ اس میں لفظ ”انسان“ انفرادی طور پر استعمال ہوا ہے۔ لہذا صرف اسی ایک خصوصیت کے ساتھ ہی انسان اپنی بہت ساری مشکلات حل کرنے کے قابل ہوتا ہے۔

انسان پر اللہ تعالیٰ نے ابتدا ہی سے لباس کا احساس بھی نازل کیا تھا:

﴿يَتَّبِعْ آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ لِبَاسًا يُورِثُ سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا﴾ (الاعراف: ۲۶)

”اے آدم کی اولاد! ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمہاری شرم گاہوں کو ڈھانپتا ہے اور آرائش و زیبائش کا سبب بھی ہے۔“

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر لباس پہننے کے فطری احساس کو الہام کیا ہے۔ اس کے جسم کو چونکہ گھنے بال نہیں دیے گئے، اس لیے متبادل کے طور پر اسے لباس کی

ضرورت و دیعت کی گئی ہے۔ اس کی وجہ سے اول تو وہ شرم و حیا کے تقاضے پورے کرے گا اور دوم موسم کی شدت سے بھی خود کو محفوظ رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ نے لباس اور لوہا بالکل ابتدا ہی میں اُتار دیا تھا جو ظاہر ہے کہ انسانوں کے استعمال ہی کے لیے تھا۔

یہ سوال تحقیق طلب ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے حضرات آدم و حوا کو جنت سے زمین پر بالکل برہنہ اتارا تھا؟ کیا یہ اس کی شانِ شہنشاہی سے مطابقت رکھتا ہے؟ سواس کے بعد یہ سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ اسے لباس کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ حد تو یہ ہے کہ خود تورات میں بھی انہیں زمین پر عریاں حالت میں اتارنے کا ذکر نہیں ہے۔ کتاب تورات پیدائش کے مطابق: ”خداوند خدا نے حیوان کے چمڑے سے پوشاک بنا کر آدم کو اور اس کی بیوی کو پہنایا۔“ (پیدائش - ۲۱:۳)

ایک نہ بھولنے والی حقیقت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم ﷺ کو ایک خصوصی صفت الگ سے بھی عطا کی تھی، اور وہ تھی علم کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر واضح کر دیا تھا کہ آدم کو ہم نے ہر قسم کے علم سے مزین کیا ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جو دنیا کے پہلے انسان کو ہر قسم کے معاملات و حالات کے سلجھاؤ میں یقیناً مدد دیتی ہوگی۔

ایک صحت مند جسم، متحرک ہاتھ پاؤں، عقل سلیم، علم اشیاء، علم اسماء، اور ایک صاف سیدھی راہ! اس پر مزید یہ کہ الہامی ہدایات بھی، یعنی غلط اور صحیح کے فرق کی درست شناخت کی حس۔ اس کے بعد پہلا انسان بھلا کہاں سے ٹھوکر کھائے گا؟ کیوں درختوں کے پتے چبائے گا؟ کیوں جانور کی کھالوں سے تن ڈھانکے گا؟ کیسے وقت گزاری کرے گا؟ کس لیے غاروں میں جا کر سویا کرے گا؟ پھر دو تین نسلوں بعد تو عقل و ذہن از خود مزید ترقی کرتے ہیں۔ اگر بالفرض وہ کھال بھی پہنے گا تو اس مقصد کی خاطر اسے کوئی جانور ذبح کرنا پڑے گا جس کے لیے چہرے اور بعدے کی ضرورت پڑے گی۔ چنانچہ نئے نئے مسائل اُبھرتے ہیں تو نئے نئے حل بھی دریافت ہوتے ہیں۔ چند عشروں کے بعد کا انسان، اپنے پہلے والے انسان سے کہیں زیادہ معتبر، کہیں زیادہ عاقل اور کہیں زیادہ مہذب بنتا جاتا ہے۔ ہر اگلے دور میں انسان سہولتوں اور تعمیرات و ترقیات کے حوالے سے نئی جدتیں پیدا کر کے سہولتوں پر سہولتیں حاصل کرتا چلا گیا ہوگا۔

ایک اور حقیقت یہ بھی ہے کہ زمین پر اتارے جانے سے قبل اللہ تعالیٰ نے حضرت



آدم ﷺ کو ایک پاکیزہ بیوی بھی عطا کی تھی؛ جنسِ انسانی کی افزائش کے ساتھ آپ کی مشکلات میں بھی دم ساز وہم راز بنی رہی تھیں۔ ان کا ایک مکمل خاندان تھا، اور وہ باہمی گفتگو کی خاطر کوئی زبان بھی استعمال کرتے ہوں گے!

دنیا کی پہلی کشتی حضرت نوح ﷺ سے منسوب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ کشتی ﴿ذَاتِ الْاَوْجِ وَدُسُورٍ﴾ (القمر) ’تختوں اور کیلوں والی‘ تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت نوح ﷺ کو اس کشتی کا ڈیزائن کس نے سمجھا یا تھا جو نہ صرف پانی میں نہیں ڈوبے بلکہ سینکڑوں انسانوں اور جانوروں کو بھی لے کر بحفاظت طویل سفر کرے؟ یہ سارے مراحل اللہ تعالیٰ کی وحی کی روشنی ہی میں تکمیل تک پہنچ رہے تھے حالانکہ اس کی تفصیل کہیں موجود بھی نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدم ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے پرسکون اور محفوظ زندگی گزارنے کے تمام طریقے وحی کے ذریعے ہی سمجھائے ہوں گے اگرچہ اس کی بھی کوئی تفصیل کتابوں میں نہیں ملتی۔

حضرت سلیمان ﷺ نے جب ملکہ بلقیس کو اپنے محل میں دعوت دی تھی تو محل کا فرش اس قدر شفاف و شیشے کی مانند تیار کروایا تھا کہ خود ملکہ بھی اس سے دھوکا کھا گئی تھی۔ پھر لوہا تھا جس کا استعمال بھی ازمنہ قدیم میں حضرت داؤد ﷺ کے دور سے شروع ہو چکا تھا۔ سیسے کی دھات حضرت ذوالقرنین کے دور سے بھی قبل زیر استعمال تھی۔ سیسے کی بے حد پختہ و اونچی دیوار جو حضرت ذوالقرنین نے کسی قوم کے لیے تعمیر کی تھی، وہ بھی تین چار ہزار سال پہلے کی ذہانت، عقل اور آرٹ کا لا جواب نمونہ تھی۔ وہ دیوار (سد) تو تاحال موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان ان دھاتوں اور ان سے متعلق ہنر کا استعمال ماقبل تاریخ بھی اپنی انتہا تک سیکھ چکا تھا۔ پھر کیسے کوئی جاہل و متعصب دانش ور اس صدی میں بیٹھ کر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ابتدائی دور کا انسان بد تہذیب اور زندگی گزارنے کے احسن طریقے سے قطعی طور پر لاعلم تھا؟ عقل ان مفکرین کے جعلی مفروضوں کی تائید کرنے سے قاصر ہے؟ ہمارے پاس تو الحمد للہ قدیم ترین دور تہذیب و تمدن تک کے باقاعدہ ثبوت اور حوالے موجود ہیں۔

حضرت آدم و حضرت شیث ﷺ کی دنیا کے بالکل ابتدائی دور کے لوگ آخر سروں کے بال بھی تو کٹواتے ہوں گے۔ پیروں تک پہنچے ہوئے بال بھلا کوئی کہاں تک سہا سکتا ہے؟ ایسے میں زندگی مشکل ہو جاتی اور نقل و حرکت ممکن نہیں رہتی۔ تو وہ کون سا آلہ یا اوزار یا ہتھیار تھا جس کی

مدد سے وہ اپنے لمبے لمبے بال چھوٹے کر دیا کرتے تھے؟ صاف ظاہر ہے کہ اپنے دور تک کی ضرورت کے تمام آلات و اوزار ’غاروں میں رہتے اور جانور کی کھالوں سے جسم ڈھانکنے والوں‘ نے دریافت کر ہی لیے تھے۔ اسی سے اس دور کے انسان میں عقل و ذہن کی موجودگی کا واضح پتہ ملتا ہے۔

یہ فلسفہ بھی زور شور کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور ساتھ میں فرضی تصویریں بھی دکھائی جاتی ہیں کہ شروع شروع میں انسان اپنے چاروں ہاتھوں کے ساتھ چلتا تھا اور اس کے جسم پر جانوروں کی مانند گھنے بال بھی تھے۔ پھر ماحول سے مطابقت رکھنے کی خاطر ہر سو دو سو سال بعد وہ کھڑا ہونے کے قابل ہوا۔ پہلے وہ کچھ جھک کر چلا اور بعد ازاں مزید سیدھا ہوا۔ تا آنکہ چھ سات سو سال بعد وہ بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس کے گھنے بال بھی ختم ہو گئے۔ ہم بتانا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی انسان سو دو سو سال تک مسلسل جھک کر نہیں چل سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ فرضی تصویروں کا مطلب ہی یہ ہے کہ ان سے اپنے لیے دلیلیں حاصل کی گئی ہیں۔ یہ سب کی سب کہانیاں ہیں۔

سوالات پر سوالات ہیں جن کے معقول جوابات کے لیے لادین دانشور ہونٹوں کو سیے بیٹھے ہیں۔ ایک شغل چھیڑ دیتے ہیں اور دنیا کو اس کی بھول بھلیوں میں گم کر دیتے ہیں۔ پھر جب ان کے آگے عقل و دانش کے سوالات رکھے جائیں تو منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مغربی فاضلین حضرت آدم ﷺ کو بے شک جو چاہے کہتے رہیں، انہیں اللہ کا پیغمبر تسلیم نہ کریں، بلکہ انسان ہی تسلیم نہ کریں، مگر ہم انہیں دنیا کے شریف ترین، مہذب ترین، صاحب علم، محمود ملائک، اشرف المخلوقات، خالق کے پیغام کے داعی اور اپنی اہلیہ کے ساتھ دنیا کو آباد کرنے والے کامیاب معمار کے طور پر تسلیم کرتے ہیں جن کے بعد دنیا نے ایک لاکھ سے زائد افضل ترین انبیاء اور کروڑوں صالح ترین شخصیات کو پایا ہے۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ عقل کی باتوں کو بنیاد بنانے والے سائنس دان، فخر سے خود ہی غیر سائنسی دعوے کرتے ہیں اور ذرا نہیں شرماتے!



Oct. 2024  
Vol.73

Regd. CPL No.115  
No.10

Monthly **Meesaq** Lahore



**Kausar**  
BANASPATI & COOKING OILS

کچھ خاص مہینے کا زمین

f KausarCookingOils

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد

کے شہرہ آفاق دورہ ترجمہ قرآن پر مشتمل

# بیان القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

● خوبصورت ٹائٹل ● سفید کاغذ ● معیاری طباعت

1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں

(اگے اگے جلدیں بھی دستیاب ہیں!)

مکمل سیٹ کی قیمت: 6000 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید

● قرآنی رسم الخط ● تفسیری ساز ● عمدہ سفید کاغذ ● مضبوط امر اوجلد

2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں

مکمل سیٹ کی قیمت: 9600 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 3-35869501 (042)